حمیدہ شاہین کی شاعری میں سماجی شعور

(تجزیاتی مطالعہ)

مقالہ نگار

قرۃ العین اعظم

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

فروری ۲۰۱۹ء

©

حمیدہ شاہین کی شاعری میں سماجی شعور

(تجزیاتی مطالعہ)

مقالہ نگار

قرۃ العین اعظم

ایم اے (اردو)، یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا

یہ مقالہ

ایم۔فل (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگوئجز

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

فروری ۲۰۱۹ء

© قرۃ العین اعظم

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، اور مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگوئجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **حمیدہ شاہین کی شاعری میں سماجی شعور (تجزیاتی مطالعہ)**

پیش کار: قرۃ العین اعظم رجسٹریشن نمبر: 1105/MPhil/Urdu/F-15

شعبہ: شعبہ اردو زبان و ادب

ڈاکٹر رخشندہ مراد _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان _____

ڈین فیکلٹی آف لینگوئجز

بریگیڈیر محمد ابراہیم _____

ڈائیریکٹر جنرل

_____

تاریخ

اقرار نامہ

میں قرۃ العین اعظم حلفیہ اقرار کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا مواد میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز اسلام آباد کے ایم فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر رخشندہ مراد کی زیر نگرانی مکمل کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گی۔

_____

قرۃ العین اعظم

مقالہ نگار

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم iii

اقرار نامہ iv

مقالے کا دائرہ کار vii

Abstract viii

مقالے کا مقصد ix

اظہارِ تشکر xi

فہرست ابواب

باب اول: موضوع کا تعارف و اصولی مباحث ۱

(الف) سماجی شعور: تعارف و مفہوم ۱

(ب) سماج اور شاعری کا باہمی تعلق ۷

(ج) اردو شاعری میں سماجی شعور: پس منظری مطالعہ ۹

۔ حوالہ جات ۲۸

باب دوم: حمیدہ شاہین کی غزل میں سماجی شعور ۳۲

(الف) حمیدہ شاہین کی غزل کا تعارف ۳۲

(دستک اور دشت وجود کے حوالے سے)

(ب) حمیدہ شاہین کی غزل میں سماجی شعور ۳۵

۲۔ فنی و اسلوبی جائزہ ۳۵

۔ رسم و رواج ۳۵

۔ طبقاتی تقسیم ۳۷

۔ عورت کا مقام ۳۸

۔ جبر و استحصال ۴۱

۔ سماجی زندگی کے مسائل ۴۴

۔ انسانی رویے ۴۶

	۔مشرقیت	۴۸
	۔اخلاقی اقدار	۴۹
۲۔	فنی واسلوبی جائزہ	۵۱
	۔زبان وبیان	۵۲
	۔تشبیہات واستعارات	۵۳
	۔تلمیحات	۵۴
	۔صنائع بدائع	۵۶
	(الف)۔صنعت تجنیس	۵۶
	(ب)۔صنعت تکرار	۵۷
	(ج)۔صنعت ایہام	۵۷
	(د)۔صنعت تضاد	۵۸
	(ر)۔صنعت مراعاۃ النظیر	۵۸
	۔حوالہ جات	۶۰
باب سوم:	حمیدہ شاہین کی نظم میں سماجی شعور	۶۴
	(الف) حمیدہ شاہین کی نظم کا تعارف (دستک اور زندہ ہوں کے حوالے سے)	۶۴
	(ب) حمیدہ شاہین کی نظم میں سماجی شعور	۶۷
ا۔	فکری وموضوعاتی جائزہ	۶۸
	۔رسم ورواج	۶۸
	۔طبقاتی تقسیم	۷۰
	۔عورت کا مقام	۷۲
	۔جبر واستحصال	۷۷
	۔سماجی زندگی کے مسائل	۸۲
	۔انسانی رویے	۸۶

	۔مشرقیت	۹۰
	۔اخلاقی اقدار	۹۲
۲۔	فنی واسلوبی جائزہ	۹۳
	۔زبان وبیان	۹۴
	۔تشبیہات واستعارات	۹۴
	۔تلمیحات	۹۶
	۔صنائع بدائع	۹۷
	الف۔صنعت تکرار	۹۸
	ب۔صنعیت ایہام	۹۹
	ج۔صنعت تضاد	۹۹
	د۔صنعت مراعاۃ النظیر	۱۰۰
	۔حوالہ جات	۱۰۲
باب چہارم:	منتخب اہم شاعرات اور حمیدہ شاہین کے سماجی شعور کا جائزہ	۱۰۵
۱۔	اداجعفری	۱۰۷
۲۔	پروین فنا سید (۱۹۳۴-۲۰۱۰ء)	۱۰۹
۳۔	زہرا نگاہ ۱۹۳۵ء	۱۱۱
۴۔	کشور ناہید ۱۹۴۰ء	۱۱۳
۵۔	شبنم شکیل ۱۹۴۶ء-۲۰۱۳ء	۱۱۴
۶۔	فہمیدہ ریاض ۱۹۴۵ء	۱۱۶
۷۔	شائستہ حبیب ۱۸ نومبر ۱۹۴۶ء	۱۱۸
۸۔	نسرین انجم بھٹی ۱۹۴۸ء	۱۲۰
۹۔	پروین شاکر (۱۹۵۶ء- ۱۹۹۴ء)	۱۲۲
۱۰۔	شاہین مفتی (۱۹۵۲ء)	۱۲۴
۱۱۔	فاطمہ حسن (۱۹۵۳ء)	۱۲۵

۱۲۔	شاہدہ حسن ۲۴ نومبر ۱۹۵۳ء	۱۲۷
۱۳۔	سارا شگفتہ ۱۹۵۶ء	۱۲۸
۱۴۔	ماہ طلعت زاہدی ۱۹۵۶ ء	۱۲۹
۱۵۔	عشرت آفرین	۱۳۰
۱۶۔	ثمینہ راجہ ۲۰۱۲ء- ۱۹۵۸ ء	۱۳۲
۱۷۔	منصورہ احمد:(۱۹۵۸ء- ۲۰۱۱ء)	۱۳۴
۱۸۔	نوشی گیلانی:(۱۴ مارچ ۱۹۶۴ء)	۱۳۵
۱۹۔	یاسمین حمید	۱۳۷
	۔حوالہ جات	۱۳۹
باب پنجم:	مجموعی جائزہ	۱۴۳
	نتائج	۱۵۲
	سفارشات	۱۵۴
	کتابیات	۱۵۵
	انٹرویو	۱۶۰

مقالے کا دائرہ کار

اس تحقیقی مقالے میں حمیدہ شاہین کی شاعری میں سماجی شعور اور اس کے اردو ادب پر اثرات کے حوالے سے تفصیلی تحقیق کی گئی ہے۔ مقالے میں حمیدہ شاہین کی نظم اور غزل کے سماجی شعور کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے اور یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ سماجی شعور کیا ہے؟ اس کے عناصر کیا ہیں؟ حمیدہ شاہین کی غزل و نظم میں سماجی شعور کن موضوعات کی صورت میں سامنے آیا ہے؟ اور حمیدہ شاہین کی شاعری میں سماجی شعور کی پیشکش کے فنی و اسلوبی طریقے کیا ہیں؟ حمیدہ شاہین کی شاعری میں سماجی رویوں کے تفصیلی مطالعے اور تجزیے کے بعد ان کی انفرادیت کا جائزہ لینے کے لیے مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

باب اول میں موضوع کا تفصیلی تعارف پیش کیا ہے اور اصولی مباحث، سماج اور شاعری کا باہمی تعلق اور اردو شاعری میں سماجی شعور کے پس منظری مطالعہ پر بحث کی گئی ہے۔

باب دوم اور سوم میں حمیدہ شاہین کی غزل اور نظم کے فکری و موضوعاتی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ان کے فنی لوازم کا بھی جائزہ لیا ہے۔ ان ابواب میں حمیدہ شاہین کی شاعری کے ایسے موضوعات جن کا براہ راست ہمارے سماج سے تعلق ہے اور جو ان کے سماجی شعور کی عکاسی کرتے ہیں مثلاً ہمارے سماجی رسم و رواج، طبقاتی تقسیم، عورت کا مقام، جبر و استحصال کی فضا، انسانی بے حسی اور رویے، مشرقیت اور بدلتی ہوئی مشرقی اقدار کو سامنے لایا گیا ہے۔

باب چہارم میں اہم شاعرات اور حمیدہ شاہین کے سماجی شعور کا جائزہ لیا ہے۔ اس باب میں ادا جعفری، زہرا نگاہ، پروین فنا سید، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، ثمینہ راجہ، فاطمہ حسن، نوشی گیلانی وغیرہ کے سماجی شعور کا جائزہ پیش کیا اور ان کے موضوعات کا مختصر اتجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔ اس ضمن میں حمیدہ شاہین کی شاعری کی انفرادیت سامنے لانے کی کوشش ہے۔

آخری باب میں مجموعی جائزہ پیش کیا ہے حمیدہ شاہین کی شاعری میں سماجی شعور کا جائزہ لیتے ہوئے مقرر کردہ تحقیقی سوالات کے جوابات پیش کیے ہیں اور موضوع سے متعلق سفارشات پیش کی ہیں۔

ABSTRACT

This research paper is **An Analysis of Social Awareness in the Poetry of Hameeda Shaheen**. Poetry is the lyrical writing that presents and explains idea or that tells about both imaginary and real people, places and events. I choose social consciousness in the poetry of Hameeda Shaheen and compared it with selective contemporary poetess. I tried to explore the new trends in poetry and it contributed in innovation of Urdu literature this dissertation tried to answer four research questions: what is social awareness? What are its elements? How is social awareness presented in the poetry of Hameeda Shaheen. What are the stylistic methods of the presentation of social awareness in the poetry of Hameeda Shaheen? What is the individuality social behavior in the poetry of Hameeda Shaheen of their detailed study and analysis? For objectives research this dissertation is divided into five chapters.

In first chapter research topic has been explained in detail. It has been explained, what is the relation between poetry and society? I also explained social awareness in Urdu poetry and its background. In next two chapters I have discussed about social awareness in the poetry of Hameeda Shaheen. I have criticaly evaluated tradition customs, class division, status of women, exploitation, problems of social life, human behaviour, easternism and moral values. I have analysed stylistically language and expression, similes and metaphors, allusion and other literary techniques. In chapter four I have analyzed social consciousness of Hameeda Shaheen and important selected poetesses.

This is the first research to study social awareness in the Hameeda Shaheen's poetry. It has been found out that poetry of Hameeda Shaheen not only produced master piece of poetry but also set new styles of writing.

مقالے کا مقصد

ہر صنف ادب اپنے عہد کے افراد کے مسائل اور سماجی رویوں کی عکاس ہوتی ہے لیکن شاعری میں یہ خصوصیت نسبتاً زیادہ واضح صورت میں سامنے آتی ہے۔ اردو شاعری اپنے عصر کے مسائل، حالات و واقعات اور سماجی صورت حال کو اس کی تمام تر جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ اپنے دامن میں سمیٹ سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی عہد کے سماجی رویوں کے تفصیلی مطالعے اور تجزیے کے لیے اس عہد میں لکھی گئی شاعری کا مطالعہ مطلوبہ نتائج کے حصول میں زیادہ مدد گار ثابت ہو سکتی ہے۔

آج جب اردو شاعری پر نگاہ ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ صورت حال ماضی کے مقابلے میں حوصلہ افزا ہے لیکن اس کے باوجود ابھی کئی گوشے ایسے ہیں جن پر کام کی گنجائش موجود ہے۔ اردو شاعری میں سماجی شعور کا مطالعہ بھی ایسا ہی موضوع ہے۔ اردو ادب میں سماجیات کا تصور ہے۔ اس حوالے سے مختلف مضامین اور کتب کی شکل میں بکھرا ہوا ملتا ہے جس کو مرتب کر کے اس کا تجزیہ کرنے اور اس میں مزید اضافہ کرنے کی ضرورت ہے۔

شاعری چونکہ کسی بھی سماج کے مجموعی رویوں اور ان کو متاثر کرنے والے عوامل کو پیش کرتی ہے اور مجموعی طور پر زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ اس لیے اس کا مطالعہ اہم ہے۔ سماجی شعور کی نشوونما کسی بھی معاشرے کی ترقی، فلاح اور انسانی رویوں کی تربیت و تہذیب میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس رویے کو بہتر بنانا اور اپنی سماجی اقدار سے ہم آہنگ کرنا ادب کا کام ہے اسی ضرورت کے پیش نظر اور شاعری میں اپنی دلچسپی کی بنا پر میں نے اپنے ایم فل کے مقالے کے لیے اس موضوع کا انتخاب کیا اور کوشش کی کہ تحقیقی و تجزیاتی ہر دو معیاروں کو پیش نظر رکھا جائے۔ یہ مقالہ سماجی حوالے سے اردو شاعری کو سمجھنے اور اس کی تفہیم کے سلسلے میں ایک کوشش ہے

اظہارِ تشکر

اس مقالے کی تکمیل کے لیے دل کی گہرائیوں سے خالق خداوندی کی شکر گزار ہوں۔ صدر شعبہ پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شہناز کی تہہ دل سے مشکور ہوں جن کے پر خلوص رویے نے ہمیشہ مجھے حوصلہ دیا جبکہ ڈاکٹر فوزیہ اسلم جو کہ میری محترم استاد ہیں انہوں نے تحقیق کے دوران نہ صرف میرا حوصلہ بلکہ اپنے مفید مشوروں سے بھی نوازا۔

اس مقالے کی تکمیل بنا رہنمائی کے کبھی بھی مکمل نہیں ہو سکتی تھی اس ضمن میں میری محترم نگران استاد ڈاکٹر رخشندہ مراد نے نہ صرف میری رہنمائی فرمائی بلکہ میری تربیت بھی کی۔ انھوں نے مقالے کی تکمیل کے دوران اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ ڈاکٹر رخشندہ مراد کی رہنمائی کے بغیر یہ تحقیقی مقالہ لکھنا میرے لیے ناممکن تھا۔ ان کی رہنمائی نے میری منزل کے کھٹن راستے کو آسان بنا دیا۔

حمیدہ شاہین نے نہ صرف مقالہ لکھنے میں میری رہنمائی کی بلکہ بہت سی کتب بھی فراہم کی جس کے لیے میں اُن کی بہت شکر گزار ہوں۔

میرے استاد گرامی شاکر کنڈان نے مقالے کے مواد کی فراہمی کے لیے ہمیشہ مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا ہے۔ انھوں نے مواد کی فراہمی سے لے کر ہر مشکل مرحلے میں میری بھرپور معاونت کی ہے۔

میری ایم اے کی دوست سائرہ حسین نے مقالے کی تکمیل کے دوران میرا حوصلہ بڑھایا۔ میں اس کی محبت بھرے خلوص کی بہت شکر گزار ہوں۔

میرے والدین کی دعاؤں اور شفقتوں نے مجھے اس منزل تک پہنچایا، ہمیشہ میری ہمت بڑھائی اور مجھے ہر طرح کی سہولیات فراہم کیں۔ بالخصوص والد محترم کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جن کے تعاون کے بغیر یہ منزل طے کرنا آسان نہ تھی۔

قرۃ العین اعظم

فروری ۲۰۱۹ء

باب اوّل:

موضوع کا تعارف و اصولی مباحث

الف) سماجی شعور: تعارف و مفہوم:۔

انسانی زندگی کے مختلف مراحل پر جب غور کیا جائے تو اس کی ابتدائی زندگی کے بارے میں جانچ خصوصی توجہ کی حامل ہے۔ اگر انسان کی ابتدائی زندگی کو دیکھا جائے تو اس نے اپنی زندگی کا آغاز جنگلوں اور غاروں میں گزر بسر کیا۔ پہلے وہ الگ تھلگ زندگی گزارتا تھا جیسے جیسے وقت بیتا، اس کی ضروریات نے سماج سے متعارف کروایا۔ انسان کی بنیادی ضرورتیں معاشرے سے ہی پوری ہوتی ہیں۔ اس کی بڑھتی ہوئی ضروریات نے اسے دوسرے انسانوں پر انحصار کرنا سیکھایا۔ انسان تنہا نہیں رہ سکتا کیونکہ بقول ارسطو "انسان ایک معاشرتی حیوان ہے"۔ سماج کے بنا اس کے لیے زندگی بسر کرنا نہ صرف مشکل بلکہ کسی حد نا ممکن ہو جاتا ہے۔ زیست کے تمام مراحل معاشرے کے اندر بخوبی انجام دیے جاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ قدرتی آفات، ماحولیاتی عناصر، بیماریوں اور موت سے انسان اکیلے مقابلہ نہیں کر سکتا، نہ ہی انفرادی طرز زندگی سے اس کی صلاحیتوں کو بھرپور طریقے سے سامنے لا سکتا ہے۔

انسانی نسل کی بقا کے لیے معاشرے کا قیام ضروری ہے۔ اس ضرورت کے تحت ہی انسان نے چھوٹے چھوٹے گروہ کی شکل میں رہنا شروع کیا جو بعد میں معاشرے کی شکل اختیار کر گیا کیونکہ سماج کی ابتدا اس غرض سے ہوئی ہے کہ ضروریات زندگی کے حصول و تقسیم میں آسانی ہے۔ سماج کی بنیاد انسان کی مالی و مادی ضروریات کی پیداوار اور تقسیم پر ہے۔ معاشرہ کب، کیسے اور کہاں بنا اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

سماج لوگوں کا گروہ ہے جو کسی یکساں مقصد کے لیے باہم متحد ہوں چاہے وہ مقصد ادبی ہو یا سیاسی، فلاحی ہو یا مذہبی۔ سماج ایک ایسی جگہ جہاں لوگ اپنی روایات، رسم و رواج، مذہب کے نظام کے تحت مل کر

زندگی گزارتے ہیں۔ ادب اور سماج کا باہمی ربط جاننے سے قبل یہ بات ضروری ہے کہ لفظ سماج کیا ہے؟ اس کے معنی و مفاہیم کو مختلف لغات اور انسائیکلوپیڈیا کے حوالے سے جانچ لیا جائے۔

سماج ہندی زبان کا لفظ ہے[۱] انگریزی میں اس کے لیے Society کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ لغوی اعتبار سے سماج کے مفاہیم و مطالب چند اہم اردو انگریزی لغات کے حوالے سے درج ہیں:

الحاج مولوی فیروز الدین نے فیروز اللغات اردو میں معنی کی یوں وضاحت کی ہے:

"سماج: ا۔ معاشرہ سوسائٹی

۲۔ انجمن۔ کمیٹی۔ محفل۔ گروہ۔ جتھا۔ ٹولی۔ منڈلی۔"[۲]

سماج کے اصطلاحی معنی اکٹھے رہنا، مل جل کر رہنا، اخلاق، رسم و رواج، روایات، مذہب اور فلسفہ کا ایک ایسا نظام جس کے تحت انسان مل کر زندگی گزارتے ہیں۔ وارث سرہندی علمی اردو جامع میں سماج کے معنی یوں لکھتے ہیں:

"سماج، سوسائٹی، جتماعتی زندگی جس میں ہر فرد کو رہنے سہنے، اپنی ترقی و بہبود کے لیے دوسروں سے واسطہ پڑتا ہے۔"[۳]

سماج ایسے افراد کا مجموعہ ہے جو اشتراک عمل کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں۔ میل جول اور تعاون کے لیے ان افراد کا مقصد ایک سا ہونا ناگزیر ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی قومی انگریزی اردو لغت میں یوں وضاحت کرتے ہیں:

"Society۔ معاشرہ۔ سماج۔ سوسائٹی۔ رفاقت۔ سنگت۔

ا۔ لوگوں کا گروہ جو کسی مشترکہ مقصد کے لیے باہم متحد ہو۔

۲۔ خصوصاً ادبی، سائنسی، سیاسی، مذہبی، فلاحی مقاصد یا شادمانی وغیرہ کے لیے افراد کا ربط و ضبط۔

۳۔ کسی خطے کے لوگ یا کسی دور کے لوگ جن میں بلحاظ اطوار، رسومات یا معیارات زیست، یگانگت پائی جائے۔"(۴)

مختلف انگریزی لغات میں مولفین نے سماج کے معنی کی وضاحتیں بیان کی ہوئی ہیں۔ چند انگریزی لغات کے حوالے سے سماج کے معنی درج ذیل ہیں:

دی سوشل سائنس انسائیکلوپیڈیا میں سماج کی تعریف یوں کی گئی ہے:

"Society :

Society is eegarded as a social environment comprising the aggregate total of people in so far as they influence and frame this or that person's behaviour.(۵)

جبکہ آکسفورڈ ایڈونس لرنر لغت میں سماج کے معنی یوں درج ہیں:

"Society:

(1) People in general living together in Communities

(2) A particular community of people who share the same customs law etc."(۶)

جامع آکسفورڈ ڈکشنری آف کرنٹ انگلش میں سماج کی تعریف اس طرح سے درج ہے۔

Society: 1- Social made of life, the customs and organization of a civilized nation,

(2) Members of a community whose movements and entertainments and other doings are more or, less

conspicuous, the socially distinguished, fashionable, leisured well - to - do, and well-connected people.(۷)

کسی بھی سماج کے پھیلنے پھولنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی جبلی خواہشات سے دستبردار ہو کیونکہ اگر وہ کسی کی جائیداد یا مویشی پر قبضہ کرے گا یا کوئی بھی غلط کام کرے گا تو معاشرہ جنگ کا میدان بن جائے گا۔ اسی وجہ سے معاشرے میں قوانین کا تعین کیا گیا تاکہ انسان اپنی حدود میں رہ کر زندگی گزاریں جو کوئی حدود تجاوز کرے اس کو سزا دی جائے۔ معاشرے میں رہنے والے افراد کو اچھے برے کی پہچان ہو گی تو ہی وہ دوسروں کو آرام و سکون مہیا کر سکے گا۔ معاشرہ انسانوں کا آپس میں باہمی رابطہ اختیار کرنے کا ذریعہ ہے۔

سماجی شعور:

سماجی شعور سے مراد کسی مخصوص عہد میں معاشرتی، تہذیبی، علمی اور فکری سطح پر رونما ہونے والے واقعات، افکار سے آگہی ہے۔ "سماجی" سماج سے مشتق ہے جو ہندی زبان کا لفظ ہے لیکن اب اردو زبان میں بھی مستعمل ہے۔ سماج کے معنی معاشرہ، گروہ، انجمن اور سوسائٹی کے ہیں جبکہ شعور عربی زبان کا لفظ ہے۔ لغوی اعتبار سے اس کے معنی عقل، تمیز، پہچان اور دانائی وغیرہ ہیں شعور کے معنی مختلف لغات میں کچھ اس طرح درج ہیں۔

آکسفورڈ ایڈوانس لرنر لغت میں معنی یوں درج ہیں:

"Awareness: (1) Knowing that some thing exists and is important.

(2) Being interested in something for example a greater/a growing/ and increasing awareness of something-enviromental awareness (=knowing that looking after the environement is important."(۸)

انگریزی آکسفورڈ لیونگ لغت میں معنی یوں درج ہیں:

"Awareness:

1- Knowledge or preception of a situation or fact.

2- Concern about and well information interest in a particular situation or development."(۹)

Meaning in Marriam websiter since 1828.

Aware: heving or showing realization, perception, or knowledge."(۱۰)

اردو کی مختلف لغات میں مولفین نے شعور کے معنی یوں درج کیے ہیں الحاج فیروز الدین نے فیروزاللغات میں شعور کے معنی کی یوں وضاحت کی ہے:

شعور: (i)۔ عقل۔سلیقہ

(ii)۔ تمیز۔پہچان

(iii)۔ سمجھ۔عقل۔دانش (۱۱)

فرہنگ آصفیہ میں سید احمد دہلوی لکھتے ہیں:

شعور: (i)۔ دانائی،واقفیت،شناخت، تمیز، پہچان

(ii)۔ سمجھ، عقل، گیان، دانش (۱۲)

وارث سرہندی علمی اردو لغت جامع میں یوں معنی درج کرتے ہیں:

شعور: (i)۔ دانائی، عقل، سلیقہ

(ii)۔ ہوش

(iii)۔ واقفیت، تمیز، پہچان [۱۳]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے قومی انگریزی لغت میں شعور کے معنی یوں درج کیے ہیں:

Awareness : خبر داری، ہوشیاری، واقفیت، آگاہی۔ [۱۴]

Universitist stellemboseh university definition of social awareness .Social awareness is defined as being aware of the problems that different societies and communities fall on a day basic and to be conscious of difficulties and hardship of society." [۱۵]

سماجی شعور اپنے عہد کے سماج، سیاست اور ارد گرد کے ماحول میں مسلسل وقوع پذیر ہونے والی تبدیلی سے آگاہ رہنا ہے۔ معاشرے میں رہنے والے افراد کو اگر حساس نہیں ہوں گے تو وہ معاشرے میں ہونے والی برائی کے خلاف آواز نہیں اٹھائیں گے جس کی وجہ سے بگڑے ہوئے سیاسی نظام اور عدل و انصاف کے تقاضے پورے نہ ہونے کی وجہ سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہو جائے گا۔ طبقاتی تقسیم اور شخصی خود غرضیوں کی وجہ سے سماجی مسائل کی نشاندہی نہیں ہو سکے گی۔ سماجی شعور کی بیداری سے معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھائی جاتی ہے۔ سماجی شعور انسان میں آگاہی کو جنم دیتا ہے۔ سماجی شعور نہ ہونے کی وجہ سے معاشرے عدم مساوات اور طبقاتی تقسیم کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کسی بھی سماج کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اس میں ہونے والی طبقاتی تقسیم، عدل و انصاف کے فقدان کے خلاف آواز اٹھائیں اور معاشرے میں ہونے والی بد اعمالیوں کے خلاف کوئی اقدام اٹھائیں گئے۔

سماجی شعور جہاں سماج کے عام افراد کے لیے اہمیت رکھتا ہے وہاں علمی و ادبی شخصیات کے لیے اس کی اہمیت عام افراد سے کہیں زیادہ ہے۔ سماجی شعور شاعری کو اپنے عہد سے جوڑنے، زندگی کے مسائل، معیار اور فکری رویوں سے آگاہ کرتا ہے۔ سماجی شعور کا سب سے بڑا وسیلہ شاعری ہے۔

ب) سماج اور شاعری کا باہمی تعلق:

شاعری معاشرے اور زندگی کی ترجمان ہے جو معاشرے میں ہونے والے اتار چڑھاؤ کو احساس اور جذبات کی صورت میں دلوں تک پہنچاتی ہے۔ شاعری اور سماج کا ایک دوسرے سے گہرا رشتہ ہے۔ شاعری پر سماج براہ راست اثر ہوتا ہے کیونکہ کوئی بھی شاعر خارجی اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کسی بھی عہد کے ادب یا شاعری کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ سیاست، سماج اور معاشرتی عوامل کا شاعری کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اردو شاعری کے موضوعات میں سماج کی جھلک نظر آتی ہے۔ معاشرے میں ہمیشہ یکسانیت نہیں رہتی بلکہ اس میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں اور ہر دور میں شاعری بھی اپنی مخصوص نوعیت کے ساتھ سماج میں اپنا کردار ادا کرتی رہی ہے۔ انسان نے سماج میں زندگی کے اصول وضوابط قائم کیے ہوئے ہیں جن کے تحت وہ زندگی گزارتے ہیں ان میں سب سے زیادہ عمل دخل مذہبی روایات اور ثقافت کا ہے جن کے تحت وہ اچھے برے کی تمیز کرتا ہے۔ ایک سماج سے تعلق رکھنے والے افراد مختلف نظریات اور عقائد کے حامل ہوتے ہیں۔ شاعری کا آغاز کب ہوا؟ کہاں سے ہوا؟ اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

مینجر پانڈے رقم طراز ہیں:

> "ادبی تخلیق ایک سماجی عمل ہے اور تخلیق ایک سماجی پیداوار، لیکن ادب کی تخلیق فرد کرتا ہے اس لیے سماج سے ادب کے رشتے کو سمجھنے کے لیے سماج سے تخلیق کار کے مضبوط تاریخی رشتے کو سمجھنا ضروری ہے جسے غیر سماجی یا ذاتی ادب کو کہا جاتا ہے اس کا بھی سماج سے ایک طرح کا رشتہ ہوتا ہے۔ یہ بھی ادبی سماجیات کے مطالعے کا ایک موضوع ہے۔ سماج کی مخالفت کرنے والے یا سماج سے بغاوت کرنے والے ادب کا، سماج سے مختلف نوعیت کا رشتہ ہوتا ہے۔"(۱۶)

معاشرے میں ہونے والی خوشی اور غمی کے واقعات، موسموں کی شدت، سماج میں ہونے والی ناانصافیوں کے موضوعات شاعری کا حصہ ہیں۔ پہلے زمانے میں لکھی جانے والی شاعری کے موضوعات کا دائرہ اتنا وسیع نہیں تھا۔ آج کے دور میں شاعری کے موضوعات میں وسعت ہے۔ موضوعات پھیلے ہوئے ہیں۔

شاعر اپنے دور کے سماجی اور سیاسی معاملات کے بارے میں اپنا ایک الگ نظریہ رکھتا ہے۔ وہ اپنی تحریروں اور تخلیق کے ذریعے ایک عہد کے سماجی نظریات اور انداز فکر کو دوسرے عہد تک پہنچانے کے فرائض انجام دیتا ہے۔ شاعری آنے والی نسل کے لیے ماضی اور حال کی تابع بھی ہوتی ہے اور اس کی عکاس بھی۔ ادب کی دیگر اصناف کی طرح اردو شاعری نے بھی عہد بہ عہد سماجی شعور کا بھرپور اظہار کیا ہے جس میں سماجی زاویہ بھی نمایاں ہے۔ حفیظ صدیقی لکھتے ہیں:

> "..... سماجی پس منظر سے الگ ہو کر خالص جمالیاتی سوچ ممکن ہی نہیں۔ ہم سماجی امور کو ادب کا موضوع کردار اور فکر و احساس کے وہ اجزا جو جزوی یا کلی طور پر سماجی ماحول کی پیداوار ہیں ادب میں شامل ہونے کے لیے بے قرار رہتے ہیں .... چنانچہ کسی ادب پارے میں سماجی زندگی کے رشتے کمزور تو ہو سکتے ہیں منقطع نہیں ہو سکتے۔"(۱۷)

شاعری کو زندگی یا سماج سے الگ نہیں کر سکتے ایسا ممکن ہی نہیں کہ شاعری سماجی صورت حال سے بیگانہ ہو۔ ڈاکٹر انور سدید رقم طراز ہیں:

> "ادب ایک ایسا سماجی عمل ہے جو زبان اور تخلیق کے حوالے سے بالواسطہ طور پر زندگی، معاشرے اور عوام کو متاثر کرتا ہے۔"(۱۸)

شاعر اپنے عہد کے حالات سے بڑا قریب ہوتا ہے اور معاشرتی رویوں، واقعات کو نہ صرف دیکھتا اور محسوس کرتا ہے بلکہ اس کا اظہار وہ اپنے کلام میں کرتا ہے۔ شاعر کا اپنے سماج سے گہرا تعلق ہوتا ہے سماج کے مسائل اس کی شاعری میں جھلکتے ہیں۔ کوئی بھی شاعر اپنے عہد کو اور عہد کے حالات کو جانے بغیر زندہ ادب یا شاعری تخلیق نہیں کر سکتا۔

شاعری زندگی کی ترجمانی کرتی ہے اور زندگی پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والے مظاہر میں سماج شامل ہے۔ تخلیقی عمل میں سماجی شعور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا بڑا شاعر نہ صرف اپنے عہد کے سماجی رویوں سے آشنا ہوتا ہے بلکہ وہ ماضی کے جھروکوں میں جھانک کر عہد گزشتہ کے احوال کو بھی دیکھتا ہے اور

اس کی کڑیاں اپنے عہد سے جوڑ کر وہ حال میں جو ادب تخلیق کرتا ہے اس میں ماضی اور حال کی آمیزش سے ایک ایسے آئینے کے طور سامنے آتا ہے جس میں مستقبل کا منظر نامہ بھی آتا ہے۔

کوئی بھی شاعر اپنے عہد اور اس کے سماجی شعور سے اپنا رشتہ نہیں توڑ سکتا۔ شاعر اپنے عہد سے لاتعلق رہ کر ادب پیدا نہیں کر سکتا۔ بقول سلام سندیلوی:

"ادب کا سماج سے علیحدہ کوئی وجود نہیں ہے.... ادب پر اس دور کے سماج کی تحریکات کا اثر پڑتا ہے اور عوام کے رجحانات کا عکاس ہوتا ہے۔"(۱۹)

بلکہ زندہ شاعری تو شعور عصر کی کوکھ میں پلتی ہے اور تخلیق پانے کے بعد صرف اپنے عہد کی ہی ترجمان نہیں ہوتی بلکہ آئندہ آنے والوں کے لیے زندہ مثال بن جاتی ہے۔

ج) اردو شاعری میں سماجی شعور: پس منظری مطالعہ:۔

شاعری ادب کی اہم صنف ہے اگر اس صنف کی ادبی روایت پر مختصراً نظر ڈالیں تو اس کا باقاعدہ آغاز تیرھویں صدی عیسوی میں نظر آتا ہے اردو زبان میں شاعری فارسی زبان کے توسط سے آئی کیونکہ اردو سے پہلے شاعری کی روایت فارسی میں ملتی ہے۔ اردو ادب میں شاعری کا آغاز دکن سے ہوا۔ دکنی دور میں اردو شاعری نے بہت ترقی کی۔ اس دور کے شعرا اپنے سماجی حالات پر نگاہ رکھتے ہیں اور ان کے ہاں سماجی شعور کی روایت ملتی ہے۔ دکنی دور میں اردو کی سبھی اصناف کی تخلیق کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ امیر خسرو اردو زبان کے پہلے شاعر ہیں۔ امیر خسرو دربار سے وابستہ ہونے کے ساتھ ساتھ عوام سے بھی منسلک تھے۔ وہ اپنے عہد کے ایسے نمائندے ہیں جنھوں نے اپنے دور کے سماجی جبر کی نمائندگی کی ہے۔ ان کے دوہوں، غزل، پہیلیوں، شعر، مثنوی، قصیدہ اور کہہ مکرنیوں میں سماجی شعور کی روایت ملتی ہے۔

پنکھا ہو کر میں ڈلی ساقی تیرا چاؤ

منجھ جلتی جنم گیا تیرے لیکھن باؤ (۲۰)

محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ یہ سولہویں صدی عیسوی کا نمائندہ شاعر ہے۔ بقول مولوی عبدالحق:

> "قلی قطب شاہ کے کلیات کے مطالعہ سے "ظل اللہ" (تخلص شاہ) کے موضوعات کے تنوع کا اندازہ ہوتا ہے۔ "متعدد مثنویاں، پھلوں اور میووں پر ہیں جن میں ایران اور خراسان ہی کے میوے نہیں بلکہ ہندوستان کے ہر قسم کے پھلوں کا بیان کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ بڑ کی، بڑولی، بنولی، منجل، گینگل، سیندولے کو بھی نہیں چھوڑا.... بہت سی مثنویاں اور غزلیں ایسی ہیں جو شاعر نے اس وقت کے رسم ورواج اور تیوہاروں مثلاً شادی کی رسوم، اپنی سالگرہ شب برات، میلاد النبیؐ، عید عزیز، سوکا۔ برسات، ہولی، بسنت، پان اور اپنے ہاتھی پر لکھی ہیں۔"(۲۱)

محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں متعدد ایسی مثنویاں موجود ہیں جو اس عہد کے رسم ورواج، کھیلوں، موسموں اور تیوہاروں کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کی مثنویاں اس عہد کی سماجی زندگی کی ترجمانی کرتی ہیں۔

سید محمد ابوالخیر کشفی رقم طراز ہیں:

> "سلطان محمد قلی قطب شاہ کے دور کی تقریبات سے اس عہد کے کلچر اور تمدنی مزاج کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔"(۲۲)

میر جعفر زٹلی نے اپنے عہد میں ہونے والی بد اخلاقی، عوام کے باہمی تعلقات، ظلم وستم اور اہل دنیا کے مسائل کو پیش کیا ہے ان کی نظموں میں اس عہد کے سماج کی اخلاقی موت کا نوحہ ہے۔ ولی دکنی، شاہ مبارک آبرو، خان آرزو اور مظہر جاناں معاصرین ہیں۔ ولی دکنی کا شمار اردو غزل کے اولین معماروں میں ہوتا ہے۔ جعفر زٹلی، ولی دکنی نے اپنی شاعری میں معاشرتی زندگی کے پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں سماجی و مقامی رنگ نمایاں ہے۔ ان کے ہاں اپنے عہد کے تہواروں، مقامات اور سماج میں ہونے والی تبدیلیوں کے موضوعات موجود ہیں جبکہ آبرو، آرزو اور جان جاناں ایہام گوئی تحریک سے وابستہ تھے۔ ولی

دکنی کی مثنوی "در تعریف شہر سورت" میں سماجی شعور کی جھلک نظر آتی ہے۔ ولی دکنی کے ہاں مختلف تجربات اور مشاہدات میں دکنی ماحول کا سماجی پس منظر نمایاں ہیں۔

باعث رسوائی عالم ولی

مفلسی ہے، مفلسی ہے، مفلسی[۲۳]

مفلسی بے کسی کی خو جاں نے

شہر دل کوں کیا ہے ویران آ[۲۴]

جعفر زٹلی کی شاعری اپنے عہد کا آئینہ ہے۔ جس میں ہمیں معاشرے کی اقدار اور معاشی ناہمواری کا عکس نظر آتا ہے۔ جعفر زٹلی نے اپنے عہد کی حقیقت کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ جعفر زٹلی کے بعد ایہام گوئی سے وابستہ شاعر آتے ہیں۔ شاہ حاتم اس دور کے اہم شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے عہد کے سماجی حالات پر نظمیں لکھی اور ان کی شہر آشوب نظموں میں ان کے عہد کی سماجی ناہمواریوں کا تذکرہ نظر آتا ہے۔

میر و سودا کا دور سیاسی اعتبار سے انتشار کا زمانہ تھا اس عہد کے نمایاں شعرا میں میر، درد اور سودا شامل ہیں۔ یہاں اس دور میں مغلیہ سلطنت معاشرتی زوال کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ مثنوی، قصیدہ اور شہر آشوب کے ذریعے اس عہد کے شعرا نے اپنے عہد کے سماجی حالات کی عکاسی کی ہے۔ مرزا رفیع سودا کی شاعری میں ان کے عہد کے حالات و واقعات کے مناظر تفصیل سے ملتے ہیں۔ یہاں اس دور میں ہونے والی سماجی تبدیلیاں، انتظامی خرابیوں اور حکومتی نااہلی کو ان کی شاعری میں واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ سودا کے "شہر آشوب" میں اس عہد کے تاجروں، عام طبقے کے لوگوں اور ان کی ملازمتوں کے عبرتناک حالات ملتے ہیں۔ ان کے شہر آشوبوں میں سماجی مسائل کا جائزہ ہے۔ سودا کی مثنویاں اپنے عہد کی سماجی زندگی کے پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں۔ سراج اورنگ آبادی کے یہاں بھی اپنے دور کے سماجی اور اخلاقی موضوعات ملتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں سوز و گداز کا عنصر موجود ہے۔

اردو شاعری کے عہد زریں پر نظر پڑتی ہے تو اس میں میر اور سودا نمایاں ہے لیکن اگر سماجی لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ ایک نہایت ہی ہنگامی دور ہے۔ ان شعرا کے ہاں ایک جیسے حالات وواقعات اور فکر مختلف انداز میں ملتے ہیں۔

میر تقی میر کی شاعری اپنے عہد کی بے ثباتی کا بیان ہے ان کی شاعری میں جگہ جگہ پر اس عہد کے حالات وواقعات کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری میں اپنے عہد کے سماجی اور انسانی رویوں کا نوحہ ہے۔ انھوں نے مشکل الفاظ اور تراکیب کا استعمال کیا ہے۔

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے

یہ نگر سَو مرتبہ لُوٹا گیا(۲۵)

میر تقی میر کی شاعری میں دلی کا نوحہ ہمیں دلی کے سماجی حالات کو بھولنے نہیں دیتا، دلی کی بربادی نے میر پر گہرے اثرات چھوڑے جن کی جھلک ان کی شاعری میں نظر آتی ہے:

شاہاں کہ لعل جواہر تھی خاک پاں جن کی

انہی کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں(۲۶)

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا

کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا(۲۷)

تری گلی سے سدا اے کشیدہ عالم

ہزاروں آتی ہوئی چارپائیاں دیکھیں(۲۸)

نظیر اکبر آبادی کی پہچان اردو میں بحیثیت عوامی شاعر ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کی شاعری کا دائرہ بہت وسیع ہے ان کی شاعری میں اپنے عہد کے سماجی حالات وواقعات، رسوم ورواج اور زندگی کی حقیقتوں کی نمایاں

جھلک نظر آتی ہے۔ نظیر اکبر آبادی پہلے شاعر ہیں۔ جنھوں نے درباروں کی بجائے عوام کے مسائل کو ان کی زبان میں بیان کیا۔ نظیر اکبر آبادی کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر محمد حسن اس طرح رقم طراز ہیں:

"سماجی احتجاج کے سب سے اہم علمبر دار نظیر اکبر آبادی جن کی شاعری نے روایت سے گریز کر کے ایک نیالب ولہجہ اختیار کیا۔ یہ لب ولہجہ عام روش کے خلاف تھا۔ جب شعراء آرائش و زیبائش کے متوالے تھے.... نظیر کورے برتن اور روٹی پر شعر کہہ رہے تھے۔"(۲۹)

نظیر اکبر آبادی کے ہاں اپنے عہد کی معاشرتی، سماجی اور تہذیبی اقدار پر ان کی نظمیں ملتی ہیں۔ انھوں نے "ہولی"، "دیوالی"، "راکھی"، "جنم"، "کھیاراس"، "مفلسی"، "بنجارہ نامہ"، "برسات" اور "دال روٹی" کے موضوعات پر نظمیں لکھی جو اپنے عہد کی عکاسی کرتی ہیں۔

گر نہ آٹے دال کا یاں کھٹکا ہوتا بار بار

دوڑتے کاہے کو پھرتے دھوپ میں پیارے سوار

اور جتنے ہیں جہاں میں پیشہ ور اور پیشہ دار

ایک بھی جی پر نہیں ہے اس سوا صبر و قرار

سب کے دل کو فکر ہے دن رات آٹے دال کا(۳۰)

بہادر شاہ ظفر مغلیہ حکومت کے آخری چشم و چراغ تھے۔ بہادر شاہ ظفر کی شاعری میں اپنے عہد کی حقیقت جھلکتی ہے۔ ان کی غزل میں دلی کی بربادی، ماتم اور معاملہ شناسی نظر آتی ہے۔

لگتا نہیں ہے جی مرا اُجڑے دیار میں

کس کی بنی ہے عالم ناپائدار میں (۳۱)

محمد ابراہیم ذوق اپنے عہد کے سماجی حالات و واقعات اور سماجی زندگی کی مروجہ اقدار کے سب سے اہم ترجمان ہیں۔ غالب اپنے عہد کا سب سے بڑا صاحب نظر اور صاحب شعور شاعر ہے۔ ان کی شاعری میں اپنے عہد کی زندگی، سماجی و کائناتی مسائل کے موضوعات نظر آتے ہیں۔ غالب کی شاعری میں دلی کے حالات

کا درد نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ غالب شمع، داغ، زخم، آتش اور رنجیر جیسی علامتیں استعمال کرتے ہوئے اپنے عہد کی تصویر پیش کرتے ہیں:

بسکہ دشوار ہے ہر کام آساں ہونا

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا(۳۲)

ابن مریم ہوا کرے کوئی

میرے دکھ کی دوا کرے کوئی (۳۳)

مومن خاں مومن، مرزا دبیر، انیس، امیر مینائی، داغ دہلوی، الطاف حسین حالی، حسرت موہانی اور علامہ اقبال انیسویں صدی کے اہم شعرا ہیں۔ مومن خان کے ہاں ذاتی سطح پر پیش آنے والے تجربات ہیں اور ان کی شاعری میں اپنے عہد کے داخلی اور خارجی دونوں اثرات نمایاں ہیں۔ وہ اپنے دور میں سماجی سطح پر ہونے والے انقلابات اور ماحول میں ہونے والی تبدیلیوں سے آگاہ تھے ان کا وہ اپنی شاعری میں اشاروں کنایوں میں ذکر کرتے نظر آتے ہیں۔ اسماعیل میرٹھی کی نظموں میں سماجی شعور کی روایت ملتی ہے جبکہ انیس و دبیر کے مرثیوں میں اس عہد کے حالات و واقعات اس عہد کی عکاسی کرتی ہیں۔ آتش و ناسخ کے ہاں بھی ان کے مرثیوں میں ان کے عہد کا نوحہ نظر آتا ہے۔

الطاف حسین حالی نے اپنی شاعری کے ذریعے ملک کی فکری فضا بدلنے میں کافی کردار ادا کیا۔ ان کے ہاں جدید رجحان نکلتا ہے۔ حالی کا دور اور اس کا پس منظر بڑا پر آشوب، کرب ناک اور تباہ کن دور تھا۔ حالی کی نظموں "برکھات"، "نشاط امید"، "حب وطن" اور "مناظرہ رحم و انصاف" میں سماجی شعور اور افکار نظر آتے ہیں۔ ان نظموں سے حالی کے سماجی شعور اور فکر کا پتہ ملتا ہے۔ "مسدس حالی" میں انھوں نے شہر کا ہی نہیں پوری تہذیب کا نوحہ بیان کیا ہے۔ نظموں کے علاوہ حالی اپنی غزل میں بھی اپنے دور کے حالات کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ الطاف حسین حالی کا عہد اور اس کا پس منظر بڑا پر آشوب، انقلاب انگیز، کرب ناک اور تباہ کن عہد تھا۔ حالی کے ہاں واضح سماجی شعور سامنے آتا ہے۔

علامہ اقبال کی شاعری نئے اسلوب کی حامل ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے مسلمانوں کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا۔ اقبال نے سورج، مشرق، دہقاں، کھیت، شرار جیسی علامتوں کو استعمال کیا۔ اقبال نے معاشرتی موضوعات مغربی و مشرقی، سیاسیات فنوں لطیفہ کے دقیق مسائل اور زندگی اور ادب کے مباحث و نکات وغیرہ کو اپنے کلام میں بڑے شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اقبال کی "خضر راہ" میں زندگی کی حقیقت کی جھلک نظر آتی ہے اور ان کے عہد کے ہنگاموں اور سماج میں ہونے والے حادثات وواقعات ملتے ہیں۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ اس تحریک سے وابستہ شعرا نے نظم کو فوقیت دی اور موضوعات میں وسعت پھیلتی گئی۔ اس عہد کے متعدد شعرا شاعری کے مختلف انداز اپناتے ہوئے اس عہد کی معاشی بدحالی اور طبقاتی تقسیم کو اپنی شاعری کا حصہ بناتے نظر آتے ہیں۔ جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، سیماب اکبر آبادی، ساغر نظامی، روش صدیقی، احسان دانش، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، اسرار الحق مجاز، معین احسن جذبی، علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، کیفی اعظمی، اختر الایمان اور ساحر لدھیانوی کے نام ان شعرا میں شامل ہیں جنھوں نے ترقی پسند تحریک کے اثرات قبول کیے۔ ان شعرا نے اپنے عہد کی سماجی بے کسی، پستی اور غلامی کے مسائل پر اپنی آواز بلند کی۔ مخدوم کی نظم جہاں تو اس دور کی معاشی بدحالی اور طبقاتی تقسیم کا اظہار کرتی ہے۔

اردو شاعری کے ارتقاء کے مختصر جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری نے وقت کے ساتھ ساتھ ارتقا کی کئی منازل طے کیں۔ قیام پاکستان کے وقت اردو شاعری پر ترقی پسند تحریک کے اثرات بہت گہرے تھے۔ تقسیم کے وقت قتل وغارت، شہروں کی بربادی، اپنے پیاروں سے بچھڑنا، بے گھر اور دربدر کی ٹھوکریں یہ سب ایسے واقعات تھے جن کو شعرا نے اپنی شاعری میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے بہت سے شعرا شاعری میں اپنا مقام بنا چکے تھے ان میں ن م راشد، فیض احمد فیض، احمد فراز، میراجی، ناصر کاظمی، احمد ندیم قاسمی اور مجید امجد وغیرہ شامل ہیں۔

حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی اپنے دور کے اہم شعرا ہیں۔ حفیظ کے گیتوں میں کہیں کہیں سماجی پس منظر کی جھلک نظر آتی ہے۔ ن م راشد کے ہاں نئے رجحان کی بھرپور عکاسی ہے۔ ان کا مجموعہ "لا=انسان"

نسل اور قوم کی سطح سے بالاتر انسانی سطح کو چھونے کی ایک کوشش ہے۔ن م راشد کے موضوعات میں تنوع اور کائناتی شعور پایا جاتا ہے۔ راشد نے اپنی شاعری میں وطن اور سماجی مسائل جیسے موضوعات پیش کیے ہیں۔ اس کی مثال ان کی نظموں "زندگی اک پیرہ زن" "تعارف"، "میرے بھی ہیں کچھ خواب" اور "اسرافیل کی موت" میں نظر آتی ہے۔ ان نظموں میں انھوں نے نہ صرف افراد کی ذاتی اور اجتماعی خود غرضی، معاشرتی بے حسی اور دیگر منفی رویوں کو اپنی مثبت و مفکر شخصیت میں تبدیل کر کے انسانی ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ "سفر" اور "ایران میں اجنبی" اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

زندگی اِک پیرہ زن!

جمع کرتی ہے گلی کوچوں میں روز شب پرانی دھجیاں!

تیز غم انگیز، دیوانہ ہنسی سے خندہ زن

بال بکھرے، دانت میلے پیرہن

دھجیوں کا ایک سونا اور ناپیدا کراں، تاریک بن![۳۴]

فیض احمد فیض نے سماجی اور معاشرتی مسائل کو اپنے شعری تجزیوں کی اساس بنایا ہے۔ ان کی شاعری میں اپنے عہد کے تمام اہم واقعات شامل ہیں۔ فیض قیام پاکستان سے پہلے کے شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے عہد کے پر آشوب ماحول کے بارے میں اپنی شاعری میں ذکر کیا ہے۔ معاشرتی زندگی کے بارے میں انھوں نے لہو کا سراغ میں نہایت درد مندی کے ساتھ اظہار کیا ہے۔ فیض نے ملکی حالات، معاشرت اور ثقافت سے گہرے اثرات قبول کیے ہیں۔ انھوں نے تیسری دنیا کے سماجی حالات کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ فیض انفرادی سوچ کے نہیں بلکہ اجتماعی سوچ کے قائل ہیں۔ "بول"، "سپاہی لیڈر کے نام"، "اے دل بیتاب ٹھہر"، "لاؤ تو قتل نامہ"، "مرا مجاز" اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ فیض کے موضوعات نے بہت سی سماجی حقیقتوں اور غموں کا احساس دلایا۔ غم زمانہ شدید تر ثابت ہوا فیض کی کچھ نظمیں بھی سماجی شعور کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر "کتے" اور "تنہائی" وغیرہ۔

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم

ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے

جابجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم

خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہائے ہوئے (۳۵)

ہم کہ ٹھہرے اجنبی کتنی مداراتوں کے بعد

پھر سے ہوں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد (۳۶)

کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار

خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد (۳۷)

میراجی کی شاعری میں ہمیں زیادہ تر ایسے موضوعات نظر آتے ہیں جن میں سیاسی و سماجی جبر اور سماجی مسائل کے موضوعات شامل ہیں۔ ان کی شاعری اپنے عہد کے سماج سے گہری وابستگی رکھتی ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں:

> "میراجی کے سماجی شعور کا اظہار ان کی کئی نظموں میں ہوا ہے۔ جہاں چھوٹے طبقوں سے ان کی واضح وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے ان کی نظم "کلرک کا نغمہ محبت" اس کی بہترین مثال ہے۔" (۳۸)

میراجی کی شاعری میں معاشرہ اپنے مختلف رنگوں کے سنگ سانس لیتا محسوس ہوتا ہے۔ ان کے ہاں موضوعات متنوع ملتے ہیں۔

میری آنکھیں ہیں کہ بازو اپنے

جیسے اک پیڑ کے ٹہنے ہوں کہیں پھیلے ہوئے

جن پہ طائر کا نشیمن لکھی بنتا ہی نہ ہو

سوکھتے جاتے ہوں ٹہنے غم محرومی سے (۳۹)

ساحر ہوشیاری، علی سردار جعفری، رئیس امروہوی اور احسان دانش کے ہاں بھی کہیں کہیں سماجی شعور کے پہلو نظر آتے ہیں۔ علی سردار کی نظمیں "عہد حاضر" اور "ایک سوال" اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ احسان دانش کی شاعری میں مزدوروں اور کسانوں کی تلخ زندگی کے لمحات اور حقیقت کی جھلک نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں معاشرے میں ہونے والی طبقاتی تقسیم، مسائل اور سماجی تجربات کی کربناک تصویریں کھینچی ہیں۔ سردار جعفری نے اپنی شاعری کو اپنے عہد کے سماجی مسائل کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ان کی "نظمیں لہو پکارتا ہے"، "شعور"، "اٹھو، مرے عزیزو، مرے رفیقو" اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ مجید امجد کی شاعری میں اپنے عہد میں ہونے والی تبدیلیوں، خوشی، غمی اور سماجی مسائل، طبقاتی تقسیم کی بھرپور عکاسی ہے۔ ان کے مجموعے "شب رفتہ" میں بعض ایسی نظمیں ہیں جن میں مختلف طبقات کی تقسیم کا ذکر ملتا ہے۔ مثال کے طور پر "خدا"، "کلیہ گاڑی میں"، "جہاں قیصر وجم" اور "درس ایام" وغیرہ اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

بہتی راوی، تیرے تٹ پر، کھیت، پھول اور پھل
تین ہزار برس بوڑھی تہذیبوں کی چھلمل
دو بیلوں کی جیوٹ جوڑی، اک ہالی، اک ہل
سینہ سنگ میں لینے والے خداؤں کا فرمان
مٹی کاٹے، مٹی جاٹے، ہل کی انی کا مان
کوئی مٹائے اس کے ماتھے سے یہ دکھوں کی ریکھ
ہل کو کھینچنے والے جنوروں ایسے اس کے پنکھ
تپتی دھوپ میں تین بیل ہیں تین بیل ہیں دیکھ (۴۰)

مجید امجد کی شاعری بیسویں صدی میں موجود زندگی کے سماجی پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہے۔ مجید امجد کی نظموں میں معاشرتی رنگ جھلکتا ہے۔ اختر الایمان کی نظم "بازدیدا" میں بھی سماجی شعور کی جھلک نظر آتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے اپنی شاعری میں سادہ اسلوب کو اپناتے ہوئے اپنے عہد کی بے ثباتیوں کو موضوع بنایا

ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے اپنے عہد کے افکار اور احساس کو اشعار کی صورت دی ہے۔ ان کی نظم "پتھر" میں وہ اپنے عہد کی اخلاقی و سماجی زوال پر نوحہ کرتے نظر آتے ہیں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار رقم طراز ہیں:

> "احمد ندیم قاسمی کے ہاں بھی اس سماجی انقلاب کی جھلک نمایاں ہے جو نعروں کے ذریعے عملی صورت اختیار کرتا، بلکہ جس کی نشوونما شعور و احساس کی گہرائیوں میں ہوئی ہے۔"(۴۱)

"احساس کی پھریری" احمد ندیم قاسمی کی نظم اس کی عمدہ مثال ہے۔ قتیل شفائی اپنی نظموں "شعلہ"، "جمہوریت"، "شناخت"، "کیڑا"، "رزق اور پتھر زلزلے"، "خون کی دستک"، "احتساب"، شہر آشوب کے ذریعے اپنے عہد کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی یہ نظمیں ان کے عہد کے سماجی شعور، سماجی تبدیلیوں اور مسائل کی عکاسی کرتی ہیں۔ ساحر لدھیانوی سماج میں عورتوں پر ہونے والے ظلم کے خلاف عورتوں کی مظلومیت سے حد درجہ متاثر رہے ہیں۔ سماجی مسائل کی شاعری ساحر کے ہاں جگہ جگہ جھلکتی ہے۔ ساحر کی شاعری میں ایسے مسائل کا ذکر ہے جن کا تعلق روز مرہ کی زندگی سے تھا۔ ساحر کے کلام میں اس کے عہد کی تصویر واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ ساحر نے طبقاتی زندگی کے تاریک پہلوؤں کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے۔ ساحر سماج کے کچلے ہوئے طبقوں پر ہونے والے جبر پر احتجاج کرتے نظر آتے ہیں۔ ساحر کی "تاج محل" میں سماجی اور تاریخی شعور جھلکتا ہے جبکہ "نور جہاں کے مزار پر" ساحر کی شاعری میں ایک مخصوص سماجی پس منظر رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ "چکلے"، "بنگال" اور "بلاوا" اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

یہ کوچے یہ نیلام گھر دلکشی کے
یہ لٹتے ہوئے کارواں زندگی کے
کہاں ہیں کہاں ہیں محافظ خودی کے
ثناخواں تقدیس مشرق کیا ہیں؟(۴۲)

اٹھو اے مظلوم انسانو!

جاگو اے مزدور کسانو!

دیکھ دھرتی کانپ رہی ہے

گرد، پھریرے ڈھانپ رہی ہے

کشٹ کی جولا پھوٹ پڑی ہے

وقت ہے تھوڑا جنگ کڑی ہے(۴۳)

ناصر کاظمی کی شاعری میں ان کا جو لہجہ سامنے آیا ہے اس میں ان تمام تہذیبوں کے زوال کا نوحہ ہے جو ابھر کر صفحہ ہستی سے مٹ گئیں ان کی شاعری میں گہرا معاشرتی شعور نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ ان کے شعروں میں ان کے عہد کے حالات و واقعات، ناسازگار حالات اور سماجی اقدار کے موضوعات پائے جاتے ہیں۔

گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ

دلی اب کے ایسی اجڑی گھر گھر پھیلا سوگ(۴۴)

اتنی خلقت کے ہوتے

شہروں میں ہے سناٹا(۴۵)

قیام پاکستان کے بعد شاعری میں ہجرت، فسادات اور ہجرت کے بعد پیش آنے والے مسائل اور سماجی زندگی کے موضوعات نظر آتے ہیں۔ حبیب جالب ترقی پسند تحریک کی پیداوار ہے۔ حبیب جالب اپنی شاعری میں عوام کے مسائل پر بات کرتا ہے۔ سماجی ناانصافی اور پھر اس ناانصافی کو برقرار رکھنے کے لیے بے پناہ ظلم و ستم ڈھائے گئے۔ یہ موضوعات جالب کی شاعری میں بہت زیادہ نظر آتے ہیں جو اس بے انصافی کا شکار ہوئے ہیں۔

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے

چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے

وہ جو سایے میں ہر مصلحت کے لیے
ایسے دستور کو، صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا(۴۶)

شہر ویراں اداس ہیں گلیاں
رہگزاروں سے اٹھ رہا ہے دھواں
آتش غم میں چل رہے ہیں دیار
گرد آلود ہے رُخ دوراں (۴۷)

منیر نیازی نے اپنی شاعری میں اپنے عہد کا کرب اور سماجی درد پیش کیا ہے۔ منیر کا سماجی شعور ان کو احتجاج کرنے پر اکساتا ہے۔ احمد فراز کی شاعری ایک ہی وقت دونوں دائروں میں گھومتی ہے۔ ایک دائرہ روایتی اور دوسرا دائرہ جدید طرز کا ہے۔ فراز کی شاعری میں سماجی مسائل کے موضوعات نظر آتے ہیں۔ فراز نے اپنا اسلوب سنوارنے کے ساتھ ساتھ استحصالی طبقے کے لیے اپنی آواز بلند کی۔ فراز کی شاعری میں سچائی اور آفاقیت ہے۔ انھوں نے زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔

یہ کون معصوم ہیں
کہ جن کو
سیاہ آندھی
دیے سمجھ کر بجھا رہی ہے
انھیں کوئی جانتا نہیں ہے
یہ کس قبیلے کے سر بکف جانثار ہیں
جن کو کوئی پہچاننا نہ چاہے
کہ ان کی پہچان امتحان ہے
نہ کوئی بچہ، نہ کوئی بابا، نہ کوئی ماں ہے
محل سراؤں میں خوش مقدر شوخِ چپ

بادشاہ چپ ہے
حرم کے پاسبان
عالم پناہ چپ ہیں
منافقوں کے گروہ کے
سربراہ چپ ہیں
تمام اہل رہا کہ جن کے لبوں پہ ہے
لالہ چپ ہیں(۴۸)

اس کے علاوہ "سلامتی کونسل"، "ویت نام" دیگر ایسی پیش کرتے ہیں۔ فہمیدہ ریاض کی نظم "زاد راہ" میں وہ معاشرے میں ہونے والی عدم مساوات اور مسائل کو پیش کرتی ہیں۔ اسی طرح ان کی نظم "روٹی کپڑا اور مکان" میں وہ معاشرے میں پھیلی ہوئی غربت و افلاس کو اپنا موضوع بناتی ہیں کہ کس طرح عوام کن کن مسائل سے دوچار ہے۔ شہزاد احمد کی نظم "بدلتے ناموں کی داستان" اور "پچیسویں سال کا عہد نامہ" بھی عمدہ مثالیں ہیں۔ پروین شاکر نظم "ایک افسر اعلی کا مشورہ" سماجی تفریق کے موضوع پر عمدہ مثال ہے۔

مختصر ایہ کہ اردو شاعری میں سماجی شعور کی روایت قدیم ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ معاشرتی تبدیلیوں سے موضوعات میں وسعت آتی گئ جبکہ جدید شاعری کے موضوعات میں وسعت نظر آتی ہے۔ جدید شاعری کے موضوعات میں صرف رومانوی ہی نہیں بلکہ سماجی، قومی، بین الاقوامی واقعات کے موضوعات نظر آتے ہیں۔ ہماری شاعری ہمارے سماج اور تہذیب کی عکاس نظمیں اور غزلیں ملتی ہیں جو سماجی مسائل کی عکاس ہیں۔ شکیب جلالی کی شاعری میں سماجی بے اطمینانی، انتشار اور گھٹن کا اظہار ملتا ہے۔

بلندیوں کے مکینو، بہت اداس ہیں ہم
زمین پہ آ کے کبھی ہم سے گفتگو تو کرو(۴۹)

اس عہد کی شاعری میں جو سماجی پہلو نظر آتے ہیں ان میں زیادہ تر غربت اور نامنصفانہ طبقاتی تقسیم کے خلاف گھٹن اور کرب ہے۔ آفتاب اقبال شمیم کی شاعری میں سماج میں ہونے والی تباہ کاریوں، مزدوروں اور کسانوں پر ہونے والے سامراجی مظالم، عدم مساوات، طبقاتی تقسیم اور دولت کی غیر مساوی تقسیم کے

حوالے سے موضوعات ملتے ہیں۔ آفتاب اقبال شمیم معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں کے مسائل کو اپنی نظموں نیا عہد نامہ، ہم، آزاد کی دعا میں پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کی ایک نظم "رچوئل" جس میں وہ تاریخی حوالے سے ذکر کرتے ہوئے موجودہ دور کے مسائل کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ" پیاسوں کے لیے ایک نظم "سماجی شعور کی عمدہ مثال ہے۔

افتخار عارف کے ہاں داخلی اور خارجی دونوں عوامل سامنے آتے ہیں۔ افتخار عارف نے ہجرت کی صعوبتیں برداشت کی ہیں ان کے ہاں سماج کی غیر مساوی تقسیم، عوامی مسائل کے حوالے سے موضوعات ملتے ہیں۔ افتخار عارف نے کربلا کے واقعات کو استعارے کے طور پر استعمال کر کے سماجی مسائل سے ملا دیا ہے۔ ان کے ہاں نسبت، گناہ و ثواب، خوف کی واردایتیں اور نفسیاتی عوامل جیسے موضوعات موجود ہیں۔ اس کے علاوہ "اپنے دوست کے نام" نظم میں انھوں نے سماج میں ہونے والی بد اخلاقیاں جیسے دھوکہ فریب اور ناانصافیوں کو موضوع بنایا ہے۔

کسی کے جور و ستم یاد بھی نہیں کرتا

عجب شہر ہے فریاد نہیں کرتا

نہ جانے کیسی قیامت گزر گئی اب کے

غریب شکوہ بیدار بھی نہیں کرتا(۵۰)

امجد اسلام امجد اپنی نظموں "سیلف میڈ لوگوں کا المیہ"، "جاگتی آنکھیں" میں معاشرے میں ہونے والے مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان نظموں میں عوام کے مسائل کو پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح اظہار الحق بھی اپنے عہد میں ہونے والے واقعات کو اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔

اردو شاعری ایک نئے آہنگ اور نئے مزاج سے آشنا ہو رہی ہے۔ نئی نسل کے شعرا اس میں نئے نئے تجربات کر رہے ہیں۔ انھوں نے نئے انداز بیان، نئی تشبیہات، نئی علامتوں کو اردو شاعری میں سمویا ہے۔

اردو شاعری میں جہاں ہمیں مرد شعراء نظر آتے ہیں وہیں ہمیں شاعرات بھی اس صنف میں طبع آزمائی کرتی نظر آتی ہیں اردو شاعری کی چند اہم شاعرات جن میں ادا جعفری، شبنم شکیل، پروین شاکر، کشور ناہید، زہرا نگاہ، فہمیدہ ریاض، منصورہ احمد، فاطمہ حسن اور نسرین انجم بھٹی وغیرہ شامل ہیں جو شاعری کی تمام اصناف کا احاطہ کرتے ہوئے ہمیں اپنے جوہر دکھاتی نظر آتی ہیں خواتین شاعرات کے کلام میں ہمیں زندگی کے تمام معاملات اور مسائل کی عکاسی نظر آتی ہیں لیکن ان سب کے ہاں خاص اور وافر مقدار میں جو مشترک رجحان سامنے آیا ہے وہ تانیثیت ہے عورت کے استحصال کے خلاف ملنے والے موضوعات میں جو عام رویہ دکھائی دیتا ہے وہ یہ ہے کہ عورت محکوم ہے یہ معاشرہ مردوں کا معاشرہ ہے جس میں عورت کی کوئی حیثیت نہیں۔ اردو شاعری میں کچھ شاعرات نے دبی آواز میں عورتوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھائی جبکہ کچھ شاعرات کے ہاں ہمیں بے باکی اور ٹھوس لہجے میں احتجاج نظر آتا ہے۔

انیسویں صدی میں عورت کچھ حد تک اپنے ارادوں اور عزائم میں مضبوط اور مستحکم ہو گئی تھی انیسویں صدی میں جہاں تانثی تحریک نے برصغیر کی عورت کو مضبوط اور مستحکم کیا وہیں ہمیں عورتوں کے دو گروہ نظر آتے ہیں ایک گروہ ایسا ہے جو ابھی بھی سماجی انقلاب کے بعد چار دیواری میں مقید ہے جبکہ دوسرا گروہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے سورج کی طرح آسمان پر غالب دکھائی دیتا ہے اسی گروہ سے تعلق رکھنے والی شاعرہ حمیدہ شاہین ہیں جو ایک ہمہ جہت شخصیت کی مالک ہیں ان کا زاویہ نگاہ سماجی شعور کی بلندیوں کو چھوتا ہے جسے اردو اب میں نمایاں مقام حاصل ہے حمیدہ شاہین اپنی شاعری کی بدولت سنجیدہ ادبی حلقوں میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔

حمیدہ شاہین نے ۲۶ جنوری ۱۹۶۳ میں کوٹ فرید ضلع سرگودھا کے علمی و ادبی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ آپ کے والدین ۱۹۴۷ء کو تقسیم دوران ہندوستان سے پاکستان آئے تھے اور ہجرت کے دوران انھوں نے بہت سے دکھ اور صعوبتیں برداشت کیں۔ حمیدہ شاہین کے والد کا نام محمد ابراہیم جبکہ ان کی والدہ کا نام حفیظ بیگم ہے۔ ان کے والد عربی و فارسی میں مہارت رکھتے تھے۔ حمیدہ شاہین کے والد عربی، فارسی، اردو اور پنجابی شعر و ادب کے علاوہ قرآن پاک کے ساتھ گہری وابستگی رکھتے تھے۔ حمیدہ شاہین کی تعلیم و تربیت کا آغاز

حفظ قرآن مجید سے ہوا۔ ان کے آٹھ بھائیوں اور بہنوں میں ان کا نمبر ساتواں ہے۔ جب حمیدہ شاہین نو برس کی ہوئی تو ان کے والد اس دنیا سے رخصت ہو گئے ان کی وفات نے حمیدہ شاہین اور ان کے گھر والوں کو گہرے صدمے سے دوچار کر دیا۔ حمیدہ شاہین کے والد کے بعد ان کی بڑی بہن سلمی تزئین جو عمر میں ان سے صرف دو سال بڑی تھیں وہ ان کا جذباتی سہارا بن گئی۔ ان کے والد کی وفات کے بعد ان کی اور ان کے بہن بھائیوں کی کفالت ان کی والدہ حفیظ بیگم نے کی۔ حمیدہ شاہین نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جس کی روایت میں مذہب اور علم شامل تھے۔ انھوں نے اپنی ابتدائی دینی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔

حمیدہ شاہین نے ایم سی گرلز سکول کوٹ فرید سرگودھا سے پنجم جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ ششم تا میٹرک تک گورنمنٹ گرلز پائلٹ سکینڈری سکول میں زیر تعلیم رہی۔ دوران تعلیم ہی حمیدہ شاہین نے ہم نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا۔ جن میں بیت بازی، تقریری مقابلہ اور مباحثے شامل ہیں جو ان کی تعلیمی زندگی کا اہم جزو بن گئے۔ تعلیم کے دوران حمیدہ شاہین نے نہ صرف ضلع سرگودھا بلکہ اس کے علاوہ بھلوال، خوشاب اور جوہر آباد میں منعقد ہونے والے ہر ادبی پروگرام میں انھوں نے اپنے سکول کی نمائندگی کی۔ انہوں نے نویں جماعت میں اپنی چند نظمیں اور غزلیں اصلاح کی غرض سے اپنی اردو کے استاد مس شمیم عزیز کی خدمت میں پیش کی جو خود بھی شعر کہتی تھیں۔ مس شمیم عزیز کی بھرپور حوصلہ افزائی اور رہنمائی نے حمیدہ شاہین کو کتب بینی کی طرف راغب کیا۔ کالج کے زمانے میں حمیدہ شاہین کی غزل پہلی بار مشرق کے ادبی ایڈیشن میں شائع ہوئی۔ ان کا پہلا انٹرویو بطور ۱۹۸۲ میں اس وقت کے ایک مقبول اخبار مشرق میں شائع ہوا۔ جب وہ سرگودھا کے گورنمنٹ کالج میں بی اے کی طالبہ تھیں۔

ایم اے کی ڈگری کے بعد حمیدہ شاہین نے ایک سال گورنمنٹ ہائی سکول چک ۷۹ شمالی ضلع سرگودھا میں بطور استاد کام کیا اور اسی طرح دوران انھوں نے بی، ایڈ کیا۔ وہ پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کر کے ۸ جنوری ۱۹۸۸ کو گورنمنٹ کالج سرگودھا میں بطور لیکچرار اسلامیات تعینات ہوئیں۔ جہاں پر انہوں نے چار سال ۸ ماہ تک تدریس فرائض انجام دیئے۔ اگست ۱۹۹۲ میں گورنمنٹ کالج برائے خواتین ڈسکہ ضلع سیالکوٹ میں سات ماہ تعینات رہیں۔ ۱۹۹۳ سے ۱۹۹۸ تک گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج برائے خواتین سٹیلائیٹ ٹاون گوجرانوالہ میں انٹر، ڈگری اور ایم۔ اے کی کلاسز کو پڑھایا۔ کچھ گھریلو مصروفیات کی بنا پر انھوں نے دو سال کی طویل رخصت لے لی۔ ۲۰۰۲ اسلامیہ کالج برائے خواتین کوپر روڈ لاہور میں بطور

اسسٹنٹ پروفیسر دوبارہ اپنے تدریسی سفر کا آغاز کیا۔ دسمبر ۲۰۰۴ میں گورنمنٹ کلیتہ البنات ڈگری کالج برائے خواتین لاہور تبادلہ ہو گیا۔وہ ۲۰۱۳ میں ترقی کے مدارج طے کرتی ہوئی ایسوسی ایٹ پروفیسر کے منصب پر فائز ہوئیں۔ یہاں ۲۰۰۹ سے ۲۰۱۸ تک شعبہ صدر اور وائس پرنسپل کے فرائض انجام دیے۔ فی الحال گورنمنٹ کالج برائے خواتین واپڈا لاہور میں تعینات ہیں وہاں وہ صدر شعبہ اور کوڈنیٹر کے عہدے پر فائز ہیں۔

حمیدہ شاہین نے ایم۔اے کے دوران جو عرصہ لاہور میں گزارا۔اس دوران ضیاء الحسن اور ان کے اہل خانہ کے ساتھ شناسائی ہوئی۔جو بعد میں ان کی زندگی کا اہم سنگ میل ثابت ہوئی۔ ۱۹۹۲ میں حمیدہ شاہین کی شادی ضیا الحسن سے ہوئی۔ان کی اولاد میں دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ضیا الحسن مظفر گڑھ کے ایک علمی اور صوفیانہ روایت کے حامل گھرانے کے چشم وچراغ ہیں۔اردو ادب میں ضیا الحسن بحیثیت شاعر اور نقاد اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ انھوں نے دیگر زبانوں سے نثر اور شاعری کے تراجم بھی کیے ہیں۔ آج کل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر اپنی تدریسی فرائض سرانجام دے رہے ہیں

حمیدہ شاہین نے شاعری کا آغاز نویں جماعت سے کیا ان کی ادبی زندگی کی شروعات کے سراغ ہمیں ان کی ابتدائی نوعیت کی سرگرمیوں میں ملتے ہیں کالج کے زمانے میں حمیدہ شاہین نے مختلف رسائل میں متعدد افسانے لکھے لیکن بعد میں انھوں نے صرف شاعری کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا ان کی ہم عصر شاعرات میں ادا جعفری، زہرا نگاہ، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، شبنم شکیل، نسرین انجم بھٹی، فاطمہ حسن، یاسمین، ثمینہ راجہ، منصورہ احمد، شاہین مفتی، نوشی گیلانی اور عشرت آفرین شامل ہیں۔

حمیدہ شاہین نے دوران تعلیم اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا ان کی تخلیق مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہی۔ حمیدہ شاہین سرگودھا میں مختلف ادبی تنظیموں سے وابستہ رہیں جبکہ پنجاب یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران میں وہ ادبی حلقوں میں متعارف ہوئیں۔ یہاں حلقہ ارباب ذوق، حلقہ ادب، حلقہ تصنیف ادب کے اجلاس اور ریڈیو پاکستان کے ادبی پروگرام حمیدہ شاہین کی ادبی تربیت میں معاون ثابت ہوئے اور حمیدہ شاہین کا کلام نہایت تیزی سے پاکستان کے نمایاں ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہونے لگا اس دور میں ان کا رجحان نظم سے زیادہ غزل کی طرف آتا ہے حمیدہ شاہین نے اپنی زندگی میں گہرے صدمات اٹھائے ہیں جن میں بچپن میں والد کا سایہ سر سے اٹھ جانا، ان کی والدہ کی جدوجہد اور پھر زندگی کے ہر قدم میں زندگی کے ساتھ قدم

ملا کر چلنے اور بڑی بہنوں کی جدائی یہ سب حمیدہ شاہین کی شاعری میں دکھ درد کے علاوہ موت کا حقیقی استعارہ اور قناعت کی کیفیات کھینچ لایا ہے۔ شاعرہ نے اپنے بچوں کی بہترین پرورش کے لیے ادبی سرگرمیوں کو اس وقت تک محدود رکھا جب تک ان کو تربیت کی بہت ضرورت تھی اپنی گھریلو ذمہ داریوں کو بخوبی نبھانے کے بعد حمیدہ شاہین نے پھر سے اپنی ادبی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ ان کی غزل میں جو تصور بعد میں ابھرتا ہے وہ روحانیت ہے حمیدہ شاہین کا رجحان نظموں کی بجائے غزلوں کی طرف زیادہ نظر آتا ہے کیونکہ اب تک ان کی غزلوں کے دو مجموعے "دستک" اور "دشت وجود" کے نام سے شائع ہوئے ہیں جبکہ ان کی نظموں کا مجموعہ "زندہ ہوں" کے نام سے شائع ہوا۔ حمیدہ شاہین کی شاعری میں ہمیں الفاظ کا خوبصورت چناؤ اور روانی نظر آتی ہے انہوں نے پابند نظم، آزاد نظم اور نثری نظم لکھی ان کے ہاں عورت کے روزمرہ تجربات و مشاہدات سے لے کر حیات و کائنات کے گہرے موضوعات موجود ہیں۔

تصانیف:۔

۱۔ دستک (شاعری) ۱۹۹۴

۲۔ دوستی (افسانے) ۱۹۹۷

۳۔ میری آپی (ناول) ۱۹۹۸

۴۔ مبادیات اسلام (بنیادی اسلامی تعلیمات) ۲۰۰۳ء

۵۔ دشت وجود (غزلیں) ۲۰۰۶

۶۔ زندہ ہوں (نظمیں) ۲۰۱۰

مجموعہ غزل اور مضامین کی کتابیں زیر طباعت ہیں۔

حمیدہ شاہین کی شاعری کے مقام و مرتبے پر پاکستان اور بیرون ممالک کی نامور شخصیات نے مضامین قلم بند کیے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف جامعات میں حمیدہ شاہین کی شاعری پر ایم۔اے کی سطح پر مقالات لکھے گے ہیں۔ جن میں یونیورسٹی آف سرگودھا، پنجاب یونیورسٹی اور یونیورسٹی آف لاہور شامل ہیں۔

حمیدہ شاہین ۸۰ کی دہائی کی شاعرہ ہیں۔ وہ ایک حقیقت پسند شاعرہ کے طور پر انسانی رویوں، سماجی و معاشی مسائل، سیاست، استحصال زدہ طبقوں، تہذیبی و ثقافتی اور ان جیسے دیگر موضوعات پر بھی قلم اٹھاتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ راجہ جیسور راؤ، اردو ہندی لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء، ص ۳۰۸

۲۔ الحاج مولوی فیروز الدین، فیروز اللغات اردو، فیروز سنز لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۸۰۸

۳۔ وارث سرہندی، علمی اردو جامع لغت، علمی کتاب خانہ کبیر سٹریٹ لاہور، ۱۹۷۹ء

۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، اسلام آباد، ۲۱ مئی ۱۹۹۴ء، ص ۱۸۸۵

۵۔ The Social Science Encyclopedia Edited by Adam Kuper and Jessica Kuper, Services book club 1989, P 794

۶۔ آکسفورڈ ایڈونس لرنر لغت، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۴ء، ص ۱۲۲۶

۷۔ The Concise Oxford Dictionary of Current English by Fowlerm How (Henry Waston), 1858, 1933, F.G (Francis George, 1870-1918, Mussay James Augustus Henry Sir, 1837, 1915, {publish 1919, Publisher Oxford, the Clarendon Press

۸۔ Oxford Advanced Learner's Dictionary of current English, A.S, Horn by; edited by Sally Wehmeier. Phonetics Editor Michale Ash by, Oxford University Press, 2004 Page 72.

۹۔ English Oxford living Dictionary, 2 April 2017,9:45, Pm

۱۰۔ Meaning in Meriam Wepsiter Since 1828, 2 April, 2017, 9:56 P.M.

۱۱۔ الحاج مولوی فیروز الدین، فیروز اللغات اردو، فیروز سنز لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۸۹۳

۱۲۔ سید احمد دہلوی، مولوی، فرہنگ آصفیہ، اردو سائنس بورڈ، اپر مال، لاہور، جلد سوم و چہارم، ص: ۱۸۱

۱۳۔ وارث سرہندی، علمی اردو جامع لغت، علمی کتاب خانہ لاہور، ۱۹۷۹ء، ص ۹۵۵

۱۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، اسلام آباد، ۱۶ مئی ۱۹۹۴ء، ص ۱۳۴

۱۵۔ Universtist stellen Bosch University, 2 April 2017, 10:00 PM

۱۶۔ مینجر پانڈے، مترجم سرور الہدی، ادب کی سماجیات (تصور اور تعبیر)، انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی، ۲۰۰۶ء، ص ۵۵

۱۷۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۹

۱۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، اختلافات، مکتبہ اردو زبان، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۲۷

۱۹۔ سلام سندیلوی، ڈاکٹر، ادب کا تنقیدی مطالعہ، مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۸۶ء، ص ۳۰

۲۰۔ ممتاز حسین، پروفیسر، امیر خسرو دہلوی حیات اور شاعری، مکتبہ جامعہ نئی دہلی لمیٹڈ، ۱۹۸۲ء ص ۳۵۱

۲۱۔ عبد الحق، مولوی، قدیم اردو، ص ۸۵، س، ن

۲۲۔ سید محمد ابو الخیر کشفی، اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر، نشریات لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۹۷

۲۳۔ سید نور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر، کلیات ولی، نامی پریس لکھنو، ۱۹۸۲ء ص ۲۵۷

۲۴۔ سید نور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر کلیات ولی، نامی پریس لکھنو، ۱۹۸۲ء، ص ۳۴۴

۲۵۔ میر تقی میر، کلیات میر، بترتیب جدید مع مقدمہ فرہنگ، مطبع نامی نولکشور لکھنو، ۱۹۴۱ء، ص ۲۲

۲۶۔ میر تقی میر، کلیات میر، بترتیب جدید مع مقدمہ فرہنگ، مطبع نامی نولکشور لکھنو، ۱۹۴۱ء، ص ۱۰۳

۲۷۔ میر تقی میر، کلیات میر، بترتیب جدید مع مقدمہ فرہنگ، مطبع نامی نولکشور لکھنو، ۱۹۴۱ء، ص ۶

۲۸۔ میر تقی میر، کلیات میر، بترتیب جدید مع مقدمہ فرہنگ، مطبع نامی نولکشور لکھنو، ۱۹۴۱ء، ص ۱۰۲

۲۹۔ محمد حسن، ڈاکٹر، اردو ادب میں رومانوی تحریک، کاروانِ ادب، ملتان، ۱۹۹۳ء، ص ۱۰۵

۳۰۔ ناصر کاظمی، انتخاب نظیرؔ، فضل الحق اینڈ سنز پبلشرز لمیٹڈ، ۱۹۹۰ء، ص ۲۵۹

۳۱۔ بہادر شاہ ظفر، دیوان ظفر، فرید بک ڈپو پرائیویٹ دہلی، ۲۰۰۲ء، ص ۲۴

۳۲۔ شمس الرحمن فاروقی، انتخاب اردو کلیات غالب، ساہتیہ اکادمی، ۱۹۹۳ء، ص ۴۲

۳۳۔ مرزا غالب، دیوان غالب اردو، نظامی پریس بدایون، ۱۹۲۷ء، ص ۲۳

۳۴۔ ن م راشد، کلیات راشد، کتابی دنیا دہلی ۶، ۲۰۱۱ء، ص ۲۹۹

۳۵۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی، ۱۹۸۹ء ص ۵۴

۳۶۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی، ۱۹۸۹ء ص ۵۳۸

۳۷۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی، ۱۹۸۹ء ص ۵۳۸

۳۸۔ رشید امجد، ڈاکٹر، میراجی شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۴ء، ص: ۲۷۶

۳۹۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، کلیات میراجی، اردو مرکز لندن، ۱۹۸۸ء، ص ۸۵

۴۰۔ خواجہ محمد زکریا، کلیات مجید امجد، الحمد پبلی کیشنز لاہور، ستمبر ۲۰۰۴ء، ص ۳۳۴

۴۱۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر، ص ۳۸۹

۴۲۔ ساحر لدھیانوی، کلیات ساحر، دعا پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص ۳۱۲

۴۳۔ ساحر لدھیانوی، کلیات ساحر، ناز پبلشنگ ہاوس دہلی، ۱۹۹۵، ص ۸۷

۴۴۔ ناصر کاظمی برگ نے، آزاد بک ڈپو، ہال بازار، امرتسر، ۱۹۹۸ء، ص ۴۶

۴۵۔ ناصر کاظمی برگ نے، آزاد بک ڈپو، ہال بازار، امرتسر، ۱۹۹۸ء، ص ۲۳

۴۶۔ حبیب جالب، کلیات حبیب جالب، ماورا پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۱۲۹

۴۷۔ حبیب جالب، کلیات حبیب جالب، ماورا پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۳۲

۴۸۔ احمد فراز، شہر سخن آراستہ ہے (کلیات)، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء، ص ۱۰۲۴

۴۹۔ شکیب جلالی، کلیات شکیب جلالی، ریختہ آن لائن، ویب سائٹ مئی ۲۰۰۴ء، ص ۲۵۹

۵۰۔ افتخار عارف، حرف باریاب، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی ۶، ۱۹۹۶ء، ص ۱۰

باب دوم:

حمیدہ شاہین کی غزل میں سماجی شعور

الف) حمیدہ شاہین کی غزل کا تعارف

(دستک اور دشت وجود کے حوالے سے)

حمیدہ شاہین عہد حاضر کی ہمہ رنگ شاعرہ ہیں ان کا شمار اسی (۸۰) کی دہائی کی ان شاعرات میں ہوتا ہے جنھوں نے غزل میں نئے تجربات کرنے کے ساتھ ساتھ پرانی روایات کی پاسداری بھی کی ہے۔ حمیدہ شاہین کے اظہار کا ذریعہ، ان کے سوچنے کا انداز اور بات کرنے کا ڈھنگ دوسرے شعرا سے منفرد ہے۔ ان کے بات کرنے کا طریقہ اور طرز ادا جدید تقاضوں کے مطابق ہے اور ان کا تخیل بھی اسی قدر آہنگ ہے کہ اس میں ایک طرح کی انفرادیت پنہاں ہے اور ان کے انداز میں ایک نیا پن جھلکتا ہے جو انہیں دیگر شعراء سے ممتاز کرتا ہے۔

حمیدہ شاہین سے پہلے کی شاعرات کے ہاں عورت کی شاعری، باغیانہ لب ولہجے کے ساتھ ساتھ شدید رد عمل ملتا ہے جبکہ حمیدہ شاہین نے عورت کے وجود کا فکری احساس دلایا اور انھوں نے صرف عورت کی حیثیت کے لحاظ سے بات نہیں کی بلکہ مختلف انسانی وجود کے طور پر کائنات کو الگ زاویے سے بھی دیکھا ہے۔ شاہد بخاری حمیدہ شاہین کی شاعری کے حوالے سے کچھ یوں رقمطراز ہیں:

> ”حمیدہ شاہین نے معاشرتی موضوعات کو گرفت میں لیا ہے لیکن وہ مسائل کا براہ راست اظہار نہیں کرتیں بلکہ اس میں کوئی نہ کوئی ایسی بات رکھ دیتی ہیں جو معاشرتی مسائل کو اعلیٰ تخلیقی تجربے میں بدل دیتی ہے۔ وہ لفظوں کے انتخاب میں اپنے تخلیقی وجدان کو کام میں لاتی ہیں اور تلازمات کا بہت خیال رکھتی ہیں۔“[1]

حمیدہ شاہین کے ہاں نسائی تفریق سے ہٹ کر زندگی و کائنات پر غور و فکر کرنے کا رویہ سامنے آیا ہے۔ ان کی شاعری میں سماجی شعور نمایاں طور پر سامنے آتا ہے کسی بھی شاعر کی شاعری میں جب تک معاشرتی معاملات و مسائل کے ساتھ ساتھ کائنات کی فکر اور انسان کی وجودی فکر کا اظہار نہ ہو اس میں وہ گہرائی نہیں ہوتی جو قارئین کو متوجہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے کوئی بھی شاعر خواہ سماجی و معاشی شعور ہی کیوں نہ رکھتا ہو جب تک اس انسان، خدا اور کائنات کے بارے میں اپنا نقطہ نظر نہ ہو وہ اعلیٰ درجے کے شاعروں کی صف میں شامل نہیں ہو سکتا۔ مبشرہ علی حمیدہ شاہین کی شاعری کے بارے میں لکھتی ہیں:

> "ان کی غزل متنوع فکری موضوعات کی حامل ہے ان کے ہاں عہد حاضر کا سماجی بحران قومی بداعمالیاں اخلاقی اجتماعی کج روی، انسانی رشوں کی ناپائیداری کے ساتھ ساتھ محبت اور اپنے نسائی وجود کا عرفان جیسے موضوعات کا بیان ملتا ہے۔"(۲)

حمیدہ شاہین یک صنفی شاعرہ نہیں بلکہ ان کے موضوعات میں تنوع ہے۔ ان کے ہاں ہمارے عصر کے سماجی اور اجتماعی مسائل کے علاوہ ایسے مضامین بھی موجود ہیں جو نسائی زاویے کو اختیار کرتے ہوئے بھی اپنی آزادی کو برقرار رکھتے ہیں۔ تانیثی زاویہ ہونے کے باوجود حمیدہ شاہین کی شاعری میں سماجی شعور کی نمایاں جھلک نظر آتی ہے۔ حمیدہ شاہین کا سماجی شعور ان کے تجربے کی دین ہے۔ ان کے سماجی شعور کا مرکز ان کے اپنے سماج کا گردوپیش اور اپنی سرزمین کے معاملات و مسائل ہیں۔ عابد حسین اپنے مضمون "نئی ترقی پسند اور حمیدہ شاہین کی شاعری" میں رقمطراز ہیں:

> "موجود زمانے میں ترقی پسند ادیبوں نے جمالیاتی اقدار کی طرف زیادہ توجہ کی ہے اور غیر ترقی پسند شاعروں نے جبر و استحصال کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ہے جس کی وجہ سے اب ترقی پسندی کی سرحدیں پھیل گئی ہیں اس کے پیچھے ترقی پسند شاعروں، ادیبوں اور نقادوں کی تقریباً پون صدی کی مسلسل کاوشوں کا دخل ہے اور اس کے نتیجہ میں موجودہ دور میں ترقی پسندی ایک نئے جاہ جلال سے جلوہ گر ہوئی ہے اس کی مثال حمیدہ شاہین کی شاعری بھی ہے جو ایک ذات کے باطنی رنگوں سے مزین ہے دوسری طرف کائنات میں انسان کے وجود و مقام سے بحث کرتی ہے اور تیسری طرف عصری حقیقتوں کو موضوع بناتی ہے۔ انھوں نے ترقی پسندی کو اپنے تخلیقی شعور کا حصہ بنایا ہے جس کی وجہ سے اس کی اثر پذیری بھی سوگنا ہو گئی ہے۔"(۳)

حمیدہ شاہین کی غزلوں میں روایتی ہی نہیں ملتے بلکہ زندگی کے بدلتے ہوئے زاویے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی غزلوں کے کچھ موضوعات حقیقت پسند اور کچھ خیالی موضوعات ہیں ان کے موضوعات کافی حد تک حقیقت سے تعلق رکھتے ہیں۔ حمیدہ شاہین زندگی کی باریکیوں کا گہرا مشاہدہ کرتی ہیں جو ان کے موضوعات میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ ان کی غزل کے موضوعات میں بہت وسعت ہے۔ شفیق احمد حمیدہ شاہین کی شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "حمیدہ شاہین کی شاعری پڑھتے ہوئے وسعت فکر و نظر اور موضوعاتی تنوع کا احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی ذات سے گھر، گھر سے سماج اور سماج سے لے کر گھر کائنات تک کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے ہاں موضوعات کی رنگارنگی ہے۔"(۴)

حمیدہ شاہین کے ہاں سماج اور اس کائنات کے حوالے سے منفرد اور پختہ شعور دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے سماجی معاملات کو بہت خوبصورتی سے اپنے تخلیقی وژن کا حصہ بنایا ہے۔ جس کی وجہ وہ منفرد اور اچھوتے نظر آتے ہیں۔ امجد طفیل اپنے مضمون "حمیدہ شاہین کی غزل: چند پہلو" میں رقمطراز ہیں:

> "حمیدہ شاہین کی شاعری میں جذبے کا گداز بھی ہے اور سوچتے ذہن کی کارفرمائی بھی۔ اس لیے مجھے گمان گزرتا ہے کہ ان کی شاعری جذبے اور عقل کے اس نقطہ اتصال پر جنم لے رہی ہے جہاں جذبہ اور عقل ایک دوسرے کے مقابل نہیں بلکہ ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ عقل جذبے کے بے لاگ اظہار کی آنچ کو دھیما کر دیتی ہے اور جذبہ بنجر عقل سے پیدا ہونے والے روکھے پن کو معتدل بنا دیتا ہے۔"(۵)

حمیدہ شاہین کا پہلا مجموعہ کلام "دستک" ہے جس میں (۳۰) نظمیں اور ۶۲ غزلیں شامل ہیں اور ان کی کل تعداد ۹۶ ہے۔ اس مجموعہ کلام میں نظموں کی نسبت غزلوں کی تعداد زیادہ ہے۔ "دستک" میں شاعرہ نے ہر دس بارہ غزلوں کے بعد نظموں کو شامل کیا ہے۔ نظمیں اور غزلیں الگ الگ نہیں ہیں۔ اس مجموعہ کلام کا آغاز و اختتام غزلوں پر ہوتا ہے۔ اس میں نظموں کی نسبت غزلیں زیادہ ہونے کی وجہ سے ہم اسے غزلوں کا مجموعہ کہہ سکتے ہیں۔ دشت وجود حمیدہ شاہین کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ افتخار عارف دشت وجود کے بارے میں لکھتے ہیں:

"غزلوں پر مشتمل یہ شعری مجموعہ اپنے ڈھب کے لحاظ سے مختلف اسلوب اور منفرد ذائقے کا حامل ہے۔ مصرعے کی تراش خراش اور بات کہنے کا ڈھنگ پڑھنے والے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ غزل میں اچھے شاعروں کی ایک پہچان یہ بھی کہی جاتی ہے کہ وہ اپنے لیے نئی زمینیں وضع کرتے ہیں۔ "دشت وجود" میں ورق ورق پر آپ کو اس کا ثبوت ملے گا تقریباً ہر غزل چمکتے ہوئے مصرعوں اور دل مبتلا کی تازہ بہ تازہ واردات سے جگمگ کرتی نظر آتی ہے۔"(۶)

ب) حمیدہ شاہین کی غزل میں سماجی شعور:۔

"دستک" اور "دشت وجود" کے حوالے سے حمیدہ شاہین کی غزلوں کے موضوعات پر بات کی جائے تو آپ کی غزل کے اہم ترین موضوعات میں رسم ورواج، طبقاتی تقسیم، عورت کا مقام، جبر واستحصال، سماجی زندگی کے مسائل، انسانی رویے، مشرقیت اور اخلاقی اقدار وغیرہ ہیں۔

ا۔ رسم ورواج:۔

رسم ورواج کے معنی دستور اور قاعدہ ہیں۔ رسم ورواج ہر سماج کا حصہ ہیں چاہے وہ کسی بھی علاقے یا ملک سے تعلق رکھتے ہوں۔ مختلف سماجوں سے تعلق رکھنے والے مختلف رسم رواجوں سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ہر علاقے کے اپنے رسم ورواج ہوتے ہیں۔ رسم ورواج پر علاقائی اثرات ہوتے ہیں۔ ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کا تعلق برصغیر سے ہونے کی وجہ سے ان کے کچھ کچھ رسم ورواج ایک جیسے ہیں۔ جن ریاستوں کے آپس میں زمینی حقائق ملتے ہیں ان کے رسم ورواج آپس میں مشابہت رکھتے ہیں۔

حمیدہ شاہین کے ہاں رسم ورواج سے متعلق اشعار ملتے ہیں۔ جن میں وہ سماج میں موجود رسم ورواج کو بیان کرتی نظر آتی ہیں اور ان کے اظہار وخیال سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ عورت کس طرح رسم ورواج میں جکڑی ہوئی ہے۔ سماج کے رسم ورواج کس طرح عورت پر لاگو ہیں۔

در، دریچے کی ضد میں نے کی ہی نہیں

سانس لینے کو کافی ہے روزن مجھے(۷)

حمیدہ شاہین نے روزن کو عورت کی آزادی سے تشبیہ دی ہے اس شعر میں حمیدہ شاہین نے بہت خوبصورتی سے نبھاتے ہوئے یہ دیکھایا ہے کہ عورت سماج کے رسم ورواج میں ناچاہتے ہوئے کس طرح جکڑی ہوئی ہے۔ وہ رشتوں اور ذمہ داریوں میں اس طرح بندھی ہوئی ہے کہ اس کے اندر کی عورت اپنی ذات اور خواہشات کا کھل کر اظہار نہیں کر سکتی اور نہ ہی سماج کے رسم ورواج اسے اس کی اجازت دیتے ہیں

میرا گھر کس قدر خوبصورت ہے ماں

کیوں نہیں بھولتا تیرا آنگن مجھے (۸)

اس شعر میں حمیدہ شاہین نے عورت کے گھر کے آنگن کو اس کی ماں کے گھر سے تشبیہ دی ہے کہ کس طرح سماج کے قائم کیے ہوئے رسم ورواج کی وجہ سے صرف اپنے سسرال کی ہو کر رہ جاتی ہے کیونکہ ہمارے سماج میں اکثر عورتوں کو کہا جاتا ہے عورت کو چاہے جو مسائل ہوں وہ اپنے شوہر کے گھر رہے گی وہی اس کا گھر ہے اس کے لیے میکے میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس بات کو حمیدہ شاہین نہایت خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ بیان کیا کہ "کیوں نہیں بھولتا تیرا آنگن مجھے" عورت چاہے کتنی ہی خوشحال کیوں نہ ہو اس کو اپنی ماں کا آنگن کبھی نہیں بھول سکتا۔

باندھتے وقت مجھ کو گماں نہ تھا

اس طرح توڑ دے گا یہ بندھن مجھے (۹)

اس شعر کی پہلی لائن "باندھتے وقت مجھ کو گماں تک نہ تھا" میں حمیدہ شاہین نے بڑی چابکدستی سے عورت کے بندھن کے بارے میں بیان کیا ہے کہ عورت جب بندھن میں بندھنے لگتی ہے تو اس کے خیالات کیا ہوتے ہیں اور کیسے عورت خیالی دنیا میں خواب پروتی رہتی ہے۔ اس کے گمان میں بھی نہیں ہوتا کس طرح اس کے حق، اس کی ذات کی نفی کر دی جائے گی اس میں شاعرہ نے بیان کیا ہے کہ کس طرح مرد سماج میں قائم رسم ورواج کا فائدہ اٹھاتے ہوئے عورت کے حقوق زائل کر دیتا ہے جس کی وجہ سے عورت کے خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں۔

بیڑیوں سے نظر میری ہٹتی نہیں

دیکھتے ہی رہے میرے کنگن مجھے[۱۰]

آخری شعر میں عورت کے کنگن کو ہتھیاروں سے تشبیہ دی گئی ہے اگر دیکھا جائے تو سماج کے رسم ورواج کے مطابق جو زیورات عورت کو پہنائے جاتے ہیں شاعرہ ان کو ہتھکڑیوں اور بیڑیوں سے تشبیہ دیتی ہے جو ایک حقیقت ہے۔

۲۔ طبقاتی تقسیم:۔

انسانی سماج میں طبقاتی تقسیم صدیوں سے رائج ہے ہمارا معاشرہ مختلف طبقات میں بٹا ہوا ہے۔ ابتداء سے لے کر اب تک جتنی بھی سماجی تنظیمیں وجود پذیر ہوئی ہیں ان میں ابتدائی اشتراکی سماجوں کو چھوڑ کر سب میں یہ طبقات موجود ہیں۔ کسی بھی سماج کے چالاک افراد بالا دستی کے لیے اپنے معاشرے میں موجود افراد کو مختلف طبقات میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے عام طور پر سماج کے ذہین افراد معاشرے کی تعمیر اور سیاست میں براہ راست شامل نہیں ہوتے ہیں بلکہ ان کی خواہش محض منافع بخش پیشوں کا حصول ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے ایک اوسط دماغ سیاست میں غالب آتا ہے۔ یہی افراد سماج کے باقی طبقوں کو اپنے زیر اثر کرنے کے لیے انھیں محکوم بنا لیتے ہیں۔ اس طرح معاشرہ مختلف طبقات میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جاگیر دار اور کسان اور اسی طرح سرمایہ دار اور مزدور۔

اُردو غزل کے موضوعات میں وسعت ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعراء کی بدولت ہوئی۔ حمیدہ شاہین سماج میں ہونے والی طبقاتی تقسیم پر نظر ثانی کرتی نظر آتی ہیں۔ اس پر نالاں بھی ہیں ان کی غزل میں طبقاتی تقسیم کا موضوع بھی نظر آتا ہے۔

مجھے اپنے بچاؤ کی لڑائی خود ہی لڑنی ہے

گواہوں میں نجانے کون سلطانی نکل آئے[۱۱]

حمیدہ شاہین نے بڑے واضح انداز میں سماج میں طبقاتی تقسیم کے بارے میں بیان کیا ہے کہ کس طرح مزدور، کسان اور نچلے طبقے کو اپنی جنگ خود لڑنی پڑتی ہے۔ ان کے حقوق کے لیے کوئی کھڑا ہوتا ہی نہیں ہے۔ انصاف کے لیے، اپنی عزت کے لیے وہ خود ہی میدان میں اترتے ہیں کیونکہ جب بھی ان کے حق کے لیے کوئی آواز اٹھاتا ہے یا تو اس آواز کو دبا دیا جاتا ہے یا غائب کر دیا جاتا ہے۔ حمیدہ شاہین نے بڑے ماہرانہ انداز میں اس موضوع کو بیان کیا ہے کہ کیا پتہ نچلے طبقے والوں کا ساتھ دینے والا خود ہی اعلیٰ طبقے کا فرد ہو اور وہ عین موقع پر نچلے طبقے کے حقوق کی جنگ چھوڑ دے۔

۳۔ عورت کا مقام:۔

سماج میں اگر عورت کے مقام کا تعین کیا جائے تو اسے دوسرا نمبر حاصل ہے اور عورت کو اسی حیثیت سے زندگی گزارنے پر مجبور کیا جاتا ہے اسے اس سماج میں اپنی مرضی اور آزادی کے ساتھ زندگی گزارنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ چاہے وہ زندگی میں کسی خاص یا بلند مقام پر ہی کیوں نہ ہو تب بھی اسے مرد کے برابر کا مقام نہیں دیا جا سکتا۔ عورت کو اپنے گھر اور مستقبل کو بچانے کے لیے قربانی دینی پڑتی ہے کیونکہ یہ سماج بنیادی طور پر مرد کا سماج ہے اور عورت اس سماج میں مجبور اور بے سہارا ہے۔ ہمارے سماج میں مرد اور عورت میں تفریق کی جاتی ہے۔ اس تفریق شروعات سب سے پہلے گھر سے ہوتی ہے کیونکہ اکثر والدین گھر میں لڑکی کے مقابلے میں لڑکے کو فوقیت دیتے ہیں اور یہ فرق صرف باپ ہی نہیں ماؤں کی اکثریت بھی روا رکھتی ہے۔ اردو شاعری میں اکثر شاعرات کی شاعری میں عورت کا دکھ اور کرب نمایاں ہے کہ اس سماج میں کس طرح مرد کو عورت پر برتری حاصل ہے اور مرد کو عورت کے مقابلے میں برتر اور بلند مقام کا حامل سمجھا جاتا ہے اور عورت کے ساتھ مرد بلکہ پورے سماج کے ناروا سلوک کی بھرپور طریقے سے عکاسی کرتی نظر آتی ہیں۔ ترقی یافتہ اور سائنسی دور ہونے کے باوجود اس سماج میں عورت کے ساتھ ناپسندیدہ سلوک کیا جا رہا ہے۔ صرف اس سماج میں ہی نہیں اگر پوری دنیا کو دیکھا جائے تو وہاں بھی عورت کے ساتھ اسی طرح کے ناروا سلوک کی مثالیں ملتی ہیں۔ حمیدہ شاہین کی شاعری کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح عورت کی حیثیت سماج میں منوانے اور سماج میں اہم مقام دلانے کا شعور ان کی غزلوں میں نمایاں ہے۔ وہ سماج میں دیگر شاعرات کی طرح محض

مرد کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتی نظر نہیں آتی بلکہ عورت کے مقام و مرتبے سے اوپر اٹھ کر مرد کے برابر کھڑی ہو کر بات کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ڈاکٹر نجیبہ عارف حمیدہ شاہین کی شاعری میں عورت کے مقام کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

> "سماجی زندگی میں عورت کا مقام، حمیدہ کی شاعری میں ایک اہم موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ عورت کے بارے میں اس کا نقطہ نظر اس کے عقیدے اور ایمان کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے مگر اس کے ہاں عورت کے اس روایتی تصور سے انحراف کے پہلو بھی نمایاں ہیں۔"(۱۲)

میری حیثیت کو مان بھی، منوا بھی

کہاں کہاں، کیا ہے میری اہمیت

لکھ(۱۳)

اس شعر میں شاعرہ نے عورت کی عزت اور مقام کا تقاضا کیا ہے۔ حمیدہ شاہین مرد اور عورت کے رشتے کی عظمت کی قائل ہیں۔ وہ عورت پر مکمل حق جتانے والے مرد سے اس کی عزت، حیثیت اور اہمیت کو منوانے کا مطالبہ کرتی ہیں کہ وہ اسے معاشرے میں وہ مقام دلائے جن کی وہ حق دار ہے۔

میرے ہر خلیے پر تیرا حق تسلیم

اپنی ذات کو بھی میری ملکیت لکھ(۱۴)

حمیدہ شاہین کے اس شعر کو دیکھا جائے تو وہ مطالبہ کرتی نظر آتی ہیں۔ سماج میں مرد حضرات خود کو حکمران مان کر عورت کی ذات کی نفی کرتے ہیں لیکن حمیدہ شاہین مرد کی حیثیت کو مانتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ بشرطیکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ عورت کی حیثیت کو بھی مانے۔ اسی طرح وہ عورت پر حق جتانے والے مرد کو یہ کہتی نظر آتی ہیں کہ مرد بھی اپنی ذات کو عورت کی ملکیت تسلیم کرے عورت محض ایک جسم ہی نہیں ہے کہ جس کے ہر خلیے پر، سانس پر، ملکیت کے طور پر وہ اسے اپنے نام کرے۔ شاعرہ یہ چاہتی ہیں کہ عورت کو حقوق دیئے جائیں۔ جن کی وہ حق دار ہے۔

امجد اسلام امجد اس حوالے سے رقمطراز ہیں:

"حمیدہ شاہین کی غزلوں میں عورت کے جو روپ نمایاں ہیں ان میں اس نوع کے حوالے سے اگر ہیں بھی تو کچھ ایسے کہ ذہن ان کی طرف جاتا ہے مگر وہاں رک نہیں جاتا۔ محبوب کے سامنے مکمل سپردگی کے عالم میں بھی اس کی ذات کسی خوش رنگ غبار میں تحلیل نہیں ہوتی بلکہ وہ برابر کی سطح پر اپنے وجود کی اکائی کو برقرار رکھتے ہوئے اس صورت حال میں قائم الذات رہتی ہے۔"(۱۵)

کون بدن سے آگے دیکھے عورت کو

سب کی آنکھیں گروی ہیں اس نگری میں(۱۶)

حمیدہ شاہین اس بات پر توجہ دلاتی ہیں کہ عورت کو ایک بدن کی طرح بروئے کار لایا جاتا ہے جو کہ زیادتی کے زمرے میں آتا ہے۔ اس کے جذبات اور اس کی اہمیت کے بارے میں کوئی نہیں سوچتا

اس خاموش رفاقت کو اب گویائی دے ڈالو

بولو گھر کی دیوارو! جو جو کچھ مجھ پر بیتا(۱۷)

ہمارے سماج کی عورت اپنے اوپر بیتنے والے مظالم پر کم ہی مزاحمت کرتی نظر آتی ہے کیونکہ وہ گھر کی چار دیواری میں مقید ہے۔ اس سے ہمیشہ اطاعت گزاری کی توقع کی جاتی ہے جبکہ حمیدہ شاہین کی شاعری میں گھر کی اس چار دیواری میں رہتے ہوئے بھی مزاحمت کی کئی صورتیں نظر آتی ہیں۔

یوں لگتا ہے صحرا میں بھاگ رہی ہوں صدیوں سے

ریت کی لہروں کو شاہیں کیوں میں نے دریا سمجھا(۱۸)

عورت کا معاشرے میں اپنا الگ مقام و مرتبہ نہ ہونے کی وجہ سے اور اپنے وجود کی محرومیوں کی وجہ سے اس کا لہجہ سخت ہو جاتا ہے اس کی ذات کی محرومیوں کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ سماج میں اپنی حیثیت اور مقام کے چکر میں عورت مسلسل گردش میں ہے۔ یہاں حمیدہ شاہین کے ہاں رجائیت کا عنصر ملتا ہے۔

۴۔ جبر واستحصال:۔

جبر کے معنی ظلم اور سختی ہیں جبکہ استحصال کے معنی چھین لیناہیں۔ ہمارا حکمران طبقہ، باری باری اقتدار میں آتا ہے اور اقتدار میں آنے کے بعد وہ ملک کے وسائل لوٹتے ہیں اور عوام کو گمراہ کرتے ہیں اور اقتدار کے ایوانوں میں جاکر انہی لوگوں کا استحصال کرتے ہیں جن کے ووٹوں سے وہ اقتدار کے ایوانوں تک جا پہنچتے ہیں۔

سماج میں غریب اور عام آدمی کا مسلسل استحصال ہو رہا ہے۔ غریب اور عام طبقے کو تعلیم، صحت اور روز گار کے مواقع فراہم نہیں کیے جاتے اور نہ ان کو عدالتوں میں انصاف ملتا ہے۔ ہمارا سماج حکمرانوں، جاگیرداروں، نوابوں اور زمینداروں کا سماج بن گیا ہے مثال کے طور پر سندھ میں وڈیرہ نظام اور پنجاب میں زمیندارانہ نظام۔ اس کی وجہ سے عام آدمی کی زندگی اجیرن بن گئی اور جہاں تک عدل وانصاف کی بات ہے تو عدالتوں سے انصاف ملتا نہیں بلکہ خریدا جاتا ہے اور انصاف وہی خرید سکتا ہے جس کے پاس مال وزر ہو جبکہ غریب آدمی ساری زندگی انصاف کے لیے عدالتوں کے چکر لگاتا رہتا ہے۔ اسی طرح ہمارے سماج میں خود ساختہ غیرت کا عنصر نمایاں ہے جس کی وجہ سے کوئی بھی اٹھ کر سماج میں موجود کسی بھی فرد کو قتل کر دیتا ہے اور جیسے بعد میں غیرت کا نام دے دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ہزاروں لوگ فٹ پاتھوں پر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں اور محنت کش طبقے کی ضروریات زندگی پوری نہ ہونے کی وجہ سے ان کے بچوں کا جبر واستحصال ہو رہا ہے۔ مزدوروں اور محنت کشوں کے بچے تعلیم حاصل کرنے کی بجائے، سکول جانے کی بجائے ہوٹلوں میں برتن دھوتے، صفائی کرتے اور چوکیداری کرتے نظر آتے ہیں اور کچھ بچے ورکشاپوں میں کام کرتے اور بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔ محنت کش طبقہ سماجی جبر واستحصال کے عام حالات میں حکمرانوں، سرمایہ داروں اور زمینداروں کی ثقافت، سماجی اقدار، اخلاقیات، تعصبات اور توہمات کی بیڑیوں میں جکڑا ہے۔ ہمارے سماج میں خواتین نے اعلیٰ تعلیم کے حصول، بہتر ملازمت اور طلاق کے حقوق جیسے معاملات میں کامیابی حاصل کرنے کے باوجود عورت ابھی بھی استحصال زدہ طبقے میں شامل ہے۔ شفیق احمد خان اپنے مضمون "دشت وجود" میں لکھتے ہیں:

"یہاں تیرگی اور قاتل و مقتول کی کہانی ہمیں اس معاشرے کی تصویر دکھائی دیتی ہے جہاں جبر کی حدیں جسم سے لے کر روح اور فکر تک پھیلی ہوئی ہیں۔ روز بروز بڑھتے اس سیاسی و سماجی انحطاط نے لوگوں کو ایک بے یقینی کے عذاب میں مبتلا کر دیا ہے اور بے یقینی کا نتیجہ کشمکش کی صورت میں سامنے آیا۔ ہم لوگ قوت فیصلہ سے محروم ہو گئے۔ تذبذب نے ہمیں بے سمتی کا شکار کر دیا"(۱۹)

حمیدہ شاہین نے سماج کے پسے ہوئے، استحصالی طبقات اور ان کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو موضوع سخن بنایا بلکہ سیاست، سماج کے معاشی وسائل کے ٹھیکے دار جو اپنے مفاد کے لیے دوسروں کے حقوق کا استحصال کرتے ہیں وہ بھی ان کے قلم کی زد سے بچ نہیں پائے کیونکہ سرمایہ دار، جاگیر دار اور حکمران طبقہ انسانی احساس اور سماجی زندگی کی تہذیب کو روندتا چلا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر

بکھری ہے ماحول میں جیسے ایک وحشت
پھیلی ہے ہر سمت کوئی بے نام کسک(۲۰)

ہر کوچے میں موت کی انجانی آہٹ
ہر دروازے پر انہونی کی دستک (۲۱)

ان اشعار میں حمیدہ شاہین براہ راست علاقائی اور حکومتی جبر کی اشارہ کرتی ہیں۔ جس کی وجہ سے ہر طرف بے نام سی خاموشی چھائی ہوئی ہے جب بھی کوئی حق کے لیے آواز اٹھاتا نظر آتا ہے تو اس آواز کو کچل دیا جاتا ہے۔ ہر طرف موت کا سماں نظر آتا ہے جس کے ڈر سے کوئی آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کرتا جس کی وجہ سے سارے زمانے میں موت کا منظر واضح انداز میں نظر آنے لگتا ہے اور جو حوصلہ کر کے اپنی آواز بلند کرتا ہے۔ وہ اعلیٰ طبقے کے استحصال کا نشانہ بن جاتا ہے جس کے ڈر کی وجہ سے کوئی بھی مقابلہ نہیں کرتا۔

امیر شہر کے لہجے میں اتنی ٹھنڈک ہے
فضا میں پھیل گئی خون میں اتر آئی(۲۲)

حمیدہ شاہین کے شعروں میں جبر واستحصال کی واضح صورتیں نظر آتی ہیں انھوں نے اس شعر میں حکمران اور جاگیر دار طبقے کو امیر شہر کہہ کر مخاطب کیا ہے کہ کس طرح حکمرانوں اور جاگیرداروں کی ناانصافیوں کی وجہ سے ہر طرف خوف زدگی کی فضا قائم ہے۔ سماج میں رہنے والے عام افراد کی زندگی قید بن کر رہ گئی ہے کس طرح حکمران اور وڈیرے اپنی حیثیت کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ اگر کوئی کام ان کی توقع کے خلاف ہو تو ہر جانب وحشت کی فضا قائم ہو جاتی ہے اور خون کی ندیاں بہائی جاتی ہیں

مچ گیا کہرام شہر چشم میں

خواب کس نے خون میں نہلا دیے(۲۳)

اس شعر میں شاعرہ نے سماج میں ہونے والے دہشت گردی کے واقعات کے پس منظر اور اس کی وجہ سے پیش آنے والے حالات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کس طرح دہشت گرد عناصر کی وجہ سے سماج زوال پذیر ہو رہا ہے۔ گھروں کے سرپرست ان کا نشانہ بن رہے ہیں اور جن آنکھوں میں خواب تھے وہ آنکھیں تکلیف سے بھر گئی۔ یہاں شاعرہ نے شہر چشم کو آنکھوں سے تشبیہ دی ہے کہ بچے جو کھلونوں کے ساتھ کھیلتے نظر آتے تھے۔ اب وہ ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔

وحشتوں نے کھیل وہ کھیلے یہاں

پھول سے بچوں کے دل سہلا دیے(۲۴)

اس شعر میں شاعرہ نے بچوں کو پھول سے تشبیہ دی ہے جس طرح پھول ناموافق موسم کی وجہ سے مرجھا جاتے ہیں اسی طرح بچے بھی سازگار حالات نہ ملنے کی وجہ سے اپنی معصومیت اور شرارتوں کو بھولتے جارہے ہیں۔ بچوں کے دلوں میں اردگرد کے ماحول سے خوف پیدا ہو گیا ہے۔ جس نے ان کے بچپن کو چھین لیا گیا ہے۔

قاتل ہی جب منصف ہوں

خون بہا دیتا ہے کون(۲۵)

سماج میں ہر فرد ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی دوڑ میں اس قدر مگن ہے کہ ان کے پاس نہ تو وقت ہے اور نہ ہی وہ ایک دوسرے سے لگاؤ رکھتے ہیں۔ عجیب سی بے حسی سماج میں چھائی ہوئی ہے۔ ہر طرف ظلم اور ناانصافی کا منظر دکھائی دیتا ہے جو سماج میں انصاف کی کرسی پر نظر آتے ہیں۔ اکثر انہی کے ہاتھ دوسروں کے خون اور استحصال سے رنگے ہوتے ہیں۔

اس سے انصاف کی امید نہ رکھو

ہاتھ جس کے ہیں ترے خون سے تر[۲۶]

حمیدہ شاہین بیان کرتی ہیں کہ جس شخص کے ہاتھ تمہارے خون اور استحصال و جبر سے رنگے ہوئے ہوں تو وہ کیسے تمہارے حق میں انصاف کا فیصلہ کرے گا یہ ناممکن ہی لگتا ہے۔

کہاں کہاں یہ ہو رہا ہے کیا تباہ دیکھنا

مرے خدا زمین کو بھی اک نگاہ دیکھنا[۲۷]

اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہیں کہ کس طرح سرمایہ دار طبقہ چھایا ہوا ہے وہ یہاں خدا بنے ہوئے ہیں اور وہ غریب طبقے کا مسلسل استحصال کر رہا ہے۔ شاعرہ اللہ تعالیٰ سے کہتی ہیں کہ اے خدا ایک بار ہماری زمین کو بھی دیکھ کہ کس طرح ہمارا سماج ظلم و زیادتی کا شکار ہے۔

سماجی زندگی کے مسائل:۔

سماجی مسئلہ ایک ایسی حالت کا نام ہے جو سماج کی اعلیٰ اقدار کے زوال کا آئینہ ہوتی ہے۔ سماج سماجی مسائل سے اس وقت دوچار ہوتا ہے جب سماج کی اکثریت آبادی ناپسندیدہ صورتحال کا سامنا کر رہی ہوتی ہے۔

سماجی مسائل اور برائیاں سماج کو گھن کی طرح کھا جاتی ہیں۔ ہمارے سماج کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہم جدید علوم سے ناواقف ہیں۔ ہمارے سماج میں علاقائی مسائل، فرقہ بندی، صوبائی عصبیت کو نظر انداز کر کے اپنی ذاتی اغراض کو فوقیت دی جاتی ہے۔ غربت بھی ہمارے سماج کا اہم مسئلہ ہے اور سماج میں تنگ

نظری بڑھتی جارہی ہے جس کی وجہ سے قوم، برادری، مذہب فرقے اور سماجی گروہ تک محدود ہو گئی ہے۔ ہمارے سماج میں عدم مساوات پائی جاتی ہے۔ نسل پرستی، غلامی اور نفرت آمیز رویوں کے علاوہ ہمارے سماج میں مذہبی اور غیر مذہبی کی تفریق بھی موجود ہے۔ عدالتی نظام میں عدل وانصاف نہ ہونے کی وجہ سے ہر طرف لاقانونیت چھائی ہوئی ہے۔

حمیدہ شاہین کی شاعری میں سماجی زندگی کے مسائل کے موضوعات ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر

دشمن اپنے گھر کے اندر پالے ہیں

اور گھر کی بربادی پر حیران بھی ہیں(۲۸)

شاعرہ ان لوگوں کی مذمت کرتی نظر آتی ہیں جو دشمن ممالک اور اپنے ملک کے مفاد کے دشمنوں کو پناہ دیتے ہیں اور بعد میں ملک کی بربادی پر حیرانی کا مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں۔

نوچ کھائیں گے آسمانوں کو

بے زمیں ہو گئے جو بے چارے(۲۹)

سماج میں ہونے والی ناانصافیوں سے پڑنے والے فرق کے بارے میں بیان کیا ہے۔ معاشرے میں ظلم وزیادتی کا شکار ہونے والے افراد جو اپنا سب کچھ گنوا دیتے ہیں۔ جب وہ ظلم کے خلاف کھڑے ہو جاتے ہیں تو اپنے اندر ہر طرح کے طوفان سے لڑنے کی صلاحیت پیدا کر لیتے ہیں۔

تمام لوگ کھلے آسماں کے نیچے ہیں

گھروں میں ایسے ہوئے تلخ تجربات کوئی(۳۰)

اس شعر میں شاعرہ نے خاندانی زندگی پر سماج کے اثرات کی وضاحت کی ہے۔ ہمارا سماج برائیوں سے اتنا گھر چکا ہے کہ جس سے خاندانی زندگی بھی متاثر ہوئی۔

انسانی رویے:۔

رویہ انسان کی شخصیت کا آئینہ ہے جس میں اس کا اصل چہرہ نظر آتا ہے کبھی کبھی چھوٹی سی باتوں پر سر تن سے جدا ہو جاتے ہیں اور عام سے اختلاف پر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ گالی گلوچ اور حد ادب سے گری ہوئی گفتگو، حسد اور طنزیہ سب رویوں کی مختلف کیفیتیں ہیں منفی رویہ رکھنے والے لوگ دوسرے سے بھی منفی رویے کی توقع رکھتے ہیں کہ ہر انسان انھیں دھوکہ دے گا اسی طرح اگر اولاد نرنیہ کے حوالے سے ہمارے سماج کے افراد کا رویہ دیکھا جائے تو بچی کے لیے یہ رویہ نہایت ہتک آمیز ہوتا ہے۔ سب لوگ بچے کی خواہش کرتے ہیں کوئی بھی سماج غیر اخلاقی رویوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا مگر اس کے باوجود انسانی رویوں میں اتار چڑھاؤ ایک فطری عمل ہے۔ انسانی رویے وقت اور حالات کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ کسی بھی سماج کے افراد کا رویہ امن اور خوشحالی کے زمانے میں مختلف ہوتا ہے اور قحط، خشک سالی اور وبا کے زمانے میں مختلف ہوتا ہے۔

ہمارے سماج کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ روز مرہ کے معاملات میں سماج کے افراد کس طرح کام کرتے ہیں۔ آج ہر فرد سماج، فطرت اور اپنے آپ سے بیگانہ ہونے کی وجہ سے تنہائی کے احساس سے گھرا ہوا ہے۔ ہر فرد ہر وقت جلدی میں رہتا ہے اور خلوص کی آڑ میں لوگوں کے جذبات کا فائدہ اٹھا کر ان کو دھوکہ دیا جاتا ہے۔ حمیدہ شاہین کی غزل میں انسانی رویوں کے موضوعات پر اشعار ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر

گنگ بیٹھے ہیں دلوں میں کہیں ایمان و یقیں

وہم ہے نغمہ سرا اور گماں ہے رقصاں[۳۱]

شاعرہ نے افراد کے رویوں کو موضوع بنایا ہے۔ سماج کے افراد کا ایک دوسرے سے اعتبار اٹھ چکا ہے اور وہ لوگ اپنے وہم کو ہی سچ سمجھتے ہیں۔ معاشرتی ناہمواری کی وجہ سے سماج میں ہونے والے ظلم و ستم، جبر و استحصال اور سماجی مسائل کی وجہ سے ماحول میں ایک عجیب سے بے اعتباری چھائی ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے سماج میں ناامیدی پھیلی ہوئی ہے۔ لوگوں میں اعتبار کی جگہ وہم و گمان کے اثرات زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔

دلوں میں آتے ہوئے ڈر رہی ہے ہمدردی

حسد نے کر دیئے سینوں میں حادثات کوئی[۳۲]

لوگوں کے دلوں میں حسد اور ہوس نے معاشرے سے مثبت رویوں کا خاتمہ کر دیا ہے لوگ ایک دوسرے کو اپنے ذاتی مفاد کے لیے نقصان پہنچانے سے بھی گریز نہیں کرتے جس کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں ساتھ دینے سے ڈرتے ہیں۔

حمیدہ شاہین کے ان اشعار میں انسانی رویوں کے بارے میں مسلسل غور و فکر ملتا ہے۔ اس موضوع پر ان کی غزلوں میں متعدد اشعار نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر

جس نے آنکھیں کھولیں اس پر پتھر برسے

سونے والوں کے اوپر پھولوں کے سائے[۳۳]

اس شعر میں انھوں نے لوگوں کی خود غرضی کی بات کی ہے کہ کس طرح سماج کے افراد خود غرض ہو گئے۔ سماج میں ایسے افراد جن کے اندر احساس ہے اور وہ غلط اور صحیح کی پہچان رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر پتھر برسائے جاتے ہیں اور وہ لوگ جو غفلت کی نیند سوئے ہیں جس کو صرف اپنی ذات سے غرض ہوتی ہے جو اپنی ذات کی حد تک خوش رہتے ہیں ایسے لوگوں کو آنکھوں پر بیٹھایا جاتا ہے۔

کسی کا سر ہو برہنہ جہاں کو کیا اس سے

اسے ہے دیکھنا گرتی کلاہ کا منظر[۳۴]

اس شعر میں سماجی پستیوں کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ سماج کے لوگ اس حد تک گر چکے ہیں کہ انھیں دوسروں کی عزت ختم ہونے کی پرواہ نہیں ہے۔ انھیں بس اپنے کام سے غرض ہے۔ انھیں کسی کے ننگے سر اور بے عزت ہونے کی پرواہ نہیں بلکہ ان کی عزتوں کا جنازہ دیکھنا چاہتے ہیں۔

نفرتوں کی آگ نے گھیری ہوئی ہیں بستیاں

ہر مکاں سے اٹھ رہا ہے اجنبیت کا دھواں[۳۵]

اس شعر میں لوگوں کے اجنبی رویوں کا ذکر کیا ہے۔ سماج کے افراد میں محبت ختم ہو کر اجنبیت میں تبدیل ہو گئی ہے۔ ہر طرف نفرتوں کا سماں ہے لوگوں کے درمیان محبت کے جذبات ختم ہو کر حقارت میں بدل گئے ہیں۔

ہر پرندہ ہو چلا ہے اس جنوں میں مبتلا

سارے گلشن میں رہے بس ایک میرا آشیاں[۳۶]

حمیدہ شاہین کی شاعری میں سماجی رویوں، ان کی وجہ سے معاشرہ میں ہونے تبدیلیوں اور ان کے اثرات کے حوالے فکر دکھائی دیتی ہے۔ سماج ہر فرد اپنی فکر میں لگا ہوا ہے ہر شخص اپنی ذات کی حد تک، اپنے مفاد کی حد تک متفکر ہے۔ ساری دنیا کو چاہے جو مرضی ہو لیکن مجھے اور میرے گھر کو کچھ نہ ہو۔

آستینوں پہ لہو کے دھبے

زیر ملبوس چھپے ہیں خنجر[۳۷]

اس شعر میں شعر میں منافقت کا تذکرہ ملتا ہے۔ کہ لوگوں نے چہرے پر ایک اور چہرہ سجا رکھا ہے۔ لوگ بظاہر جو نظر آتے ہیں لیکن در حقیقت وہ کچھ اور ہی ہوتے ہیں۔ لوگ ہمدردی کی آڑ میں ایک دوسرے کا نقصان کرنے سے باز نہیں آتے۔

مشرقیت:۔

ہمارے سماج میں ابھی تک مشرقیت موجود ہے۔ یہاں آج بھی حیا اور شرم کو اہمیت دی جاتی ہے۔ مبشرہ علی لکھتی ہیں:

> ”حمیدہ شاہین ایسے گندھے ہوئے خیالات کی مالک شاعرہ ہیں جن کی مشرقیت ان کے لفظوں سے جھلکتی ہے۔“[۳۸]

مثال کے طور پر:

گوری گندم چھٹک رہی ہے

بانہہ میں چوڑی کھنک رہی ہے[۳۹]

چھاج میں سونے کے موتی ہیں

مکھ پر چاندی چمک رہی ہے

بدن پسینے میں ڈوبا ہے

چنری سر سے ڈھلک رہی ہے[۴۰]

کرتی ہے کم ذات چھنن چھن

پاؤں میں اک مات چھنن چھن

چرخے میں گھنگرو بندھوا لے

اپنے آپ کو کات چھنن چھن

کھن کھن بولے بانہہ میں کنگن

چوڑی والے ہات چھنن چھن[۴۱]

اخلاقی اقدار:۔

اخلاقی اقدار سے مراد اچھے وبرے کی تمیز، نیکی وبدی کی پہچان وغیرہ۔ جب انسان میں عقل جلوہ گر ہوتی ہے تو اس میں اخلاقی اقدار مثلاً نیکی وبدی، جائز وناجائز، خیر وشر، حرام وحلال، ایمانداری وبے ایمانی اور انسانیت وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔ انسان اپنی ذات کے فائدے کی خاطر جھوٹ بولتا ہے اور وعدہ خلافی بھی کرتا ہے، رشوت لینا، کرپشن کرنا، سماج اور ملک کے مفادات کو نقصان پہنچانے کو معیوب نہیں سمجھتے۔ انسان جب

بھی اپنی ضروریات پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اخلاقی اقدار اس کو غلط راستہ اختیار کرنے سے روکتی ہیں۔ کچھ افراد اپنی ہر جائز اور ناجائز ضد پوری کرنے کے لیے اخلاقی قدروں کو پس پشت ڈال دیتے ہیں جس کی وجہ سے سماج اور پوری قوم تباہی کا شکار ہوتی ہے جب اخلاقی قدریں مردہ ہونے لگتی ہیں تو سماج میں ظلم عام ہو جاتا ہے۔ حمیدہ شاہین کے ہاں اخلاقی اقدار کی بے قدری کے موضوعات نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر

لوگوں کے دل میں گھر کرنے کا گر سیکھ

جو تاراج نہ ہو پائے، وہ شہر بسا[۴۲]

شاعرہ اخلاقی اقدار کی پستیوں پر اپنی آواز بلند کرتی نظر آتی ہیں۔ معاشرتی و اخلاقی اقدار کے زوال کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے کے دل سے اتر رہے ہیں۔ وہ مقام اور عزت جو ان کے دلوں میں ہوتا تھا، اب نہیں رہا۔ شاعرہ نصیحت کرتی نظر آتی ہیں کہ ایک دوسرے کی قدر کرنا سیکھو۔ دلوں میں اس طرح گھر کرنے کی کوشش کرو کہ وہ مقام، وہ عزت کبھی زوال پذیر نہ ہو۔

اونچی دستاریں بوٹوں کے نیچے ہیں

اب کچھ شانوں کے اوپر سر رہتے ہیں[۴۳]

یہاں معاشرے کی بری صورتحال کو بیان کیا ہے۔ اخلاقی اقدار اس قدر پست ہو چکی ہیں کہ اعلیٰ اقدار کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ اخلاقی اقدار کی اہمیت ختم ہو چکی ہے۔ وہ افراد جن کو سماج میں اعلی مقام اور عزت ملنی چاہیے۔ معاشرہ ان کو وہ عزت، وہ مقام نہیں دیتا لیکن طاقتور طبقات اور حکمرانوں کو سر آنکھوں پر بیٹھایا جاتا ہے۔

رونے والوں پر ہنسنے کا جرم نہ کرنا

جانے وقت کہاں، کب، کیسا دکھ دے جائے[۴۴]

شاعرہ دوسروں کے دکھ اور تکلیف پر ہنسنے سے ممانعت کرتی نظر آتی ہیں۔ آج کل دوسروں کے دکھ میں ان کا ساتھ دینے کی بجائے لوگ ان کے دکھ پر ہنستے نظر آتے ہیں۔ شاعرہ اس بارے میں احتیاط کرنے کا کہتی ہیں کہ جانے یہ وقت کب پلٹ جائے اور تم پر آجائے۔

یہ کس برہنگی کا خوف ہے کہ اپنے جسم کو

ہر ایک شخص ڈھک رہا ہے، دوسروں کی کھال سے[۴۵]

لوگ اپنی عزت بچانے کے لیے دوسروں کی عزت داؤ پر لگا دیتے ہیں اور اپنے گناہوں کو چھپانے کے لیے ان کا بوجھ دوسروں کے کندھوں پر ڈال دیتے ہیں۔

۲۔ فنی واسلوبیاتی جائزہ:۔

اچھی شاعری کے لیے بلند فکر وخیال اور تجربات ومشاہدات ہونے کے ساتھ ساتھ ان کو پیش کرنے کے لیے لفظ اور ان کو لکھنے کا ڈھنگ اور فنی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ زبان وبیان کو شاعری میں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ زبان کی سلاست، صفائی اور بے ساختگی بھی اہم ہے۔ حمیدہ شاہین کی غزل کے بارے میں ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہیں:

> ”حمیدہ کی غزلوں میں ترکیب سازی پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ جلوہ دیر یاب ودز دیدہ، حشر انگیزی حجاب، برگ آوارہ، صید گیر خوش خصال وخوش ادا، صدائے وحشت گل، چشم بخت کشا، دیچہ حسن نظر، کوزہ حیرت اور اس جیسی کئی اور تراکیب اس کی غزلوں کو معنی آفرینی کی ایک نئی جہت عطا کرتی ہیں۔ اس نے ان تراکیب کی مدد سے ٹھوس اور واضح امیجز تخلیق کیے ہیں، اس کی امیجری میں تحرک اور روانی کا احساس بھی فراواں ہے۔ کہیں بڑھتی ہوئی روشنی، کہیں کناروں سے چھلکتی ہوئی موجہ فکر، کہیں کسی کومل سر کی تان کا ٹھہراؤ، کہیں گدگداتی ہوئی ہوا، کہیں اصوات کا صحرائے رواں، کہیں رقص طرب، کہیں لپٹی ہوئی آگ، یہ سب تصویریں ایک مسلسل بہاؤ اور حرکت کی پیغام بر ہیں۔“[۴۶]

حمیدہ شاہین کی غزلوں کے مجموعے کا فکری و موضوعاتی جائزہ لینے کے بعد ضروری ہے کہ فنی نقطہ نگاہ سے بھی ان کی غزلوں کا جائزہ لیا جائے۔ حمیدہ شاہین کی غزلوں میں منفرد اسلوب اور مختلف تراکیب نے ان کی غزل کو ایک الگ پہچان دی ہے۔ ذیل میں ان کی غزلوں کا فنی جائزہ لیا گیا ہے۔

زبان و بیان:۔

حمیدہ شاہین کی غزل کی زبان میں روانی اور سلاست ہے لیکن ان کا آہنگ،طرز ادا اور الفاظ کا چناؤ دوسروں سے منفرد ہے اور اس خصوصیت کی وجہ سے انہیں دیگر شعراء میں انفرادیت حاصل ہے۔حمیدہ شاہین کی غزلوں میں فارسی، عربی اور ہندی زبانوں کے الفاظ کا امتزاج ملتا ہے اردو فارسی اور عربی کی مرہون منت ہے کیو نکہ اردو میں فارسی اور عربی زبان کے بہت سے الفاظ شامل ہیں ان کو ہم اردو سے الگ نہیں کرسکتے۔ اردو شاعری میں کہیں کہیں ہندی زبان، لب و لہجے اور روایت کے اثرات نظر آتے ہیں۔ ہندی کے کچھ ایسے بھی الفاظ ہیں جو اب اردو میں عام استعمال ہو رہے ہیں جبکہ کچھ ایسے لفظ بھی ہیں جو اردو میں ابھی پوری طرح مستعمل نہیں ہیں۔ حمیدہ شاہین کی غزل میں ہندی زبان کی روایت ،مزاج جس کے پرانی اردو میں اثرات تھے نظر آتے ہیں۔ حمیدہ شاہین نے اپنی غزل میں ہندی مزاج، لب و لہجہ اور آہنگ سمویا ہے۔ اس سے انہوں نے اپنی غزل کو خوبصورت بنایا ہے۔ حمیدہ شاہین نے اپنی غزل میں گیت کے آہنگ اور ہندی لفظیات کو استعمال کر کے اس میں ترنم اور چاشنی پیدا کی ہے۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف حمیدہ شاہین کی شاعری میں فارسی کی تراکیب کے بارے میں کہتی ہیں:

"حمیدہ شاہین کی غزل اردو اور فارسی کلاسیکی روایات اور جدید طرز احساس کا خوبصورت امتزاج ہے"(۴۷)

مثال کے طور پر:

دل کا دل کھیل ہے، سر کا سر سے میل

تال ملے من بھاؤنا ہو جائے سنگیت (۴۸)

کارے بدرا جرا برس تو سہی

جا رہا ہے کہاں کو بھاگا رے (۴۹)

تشبیہات واستعارات:۔

شاعری میں تشبیہات اور استعارات کے استعمال سے نکھار آتا ہے۔ عام طور پر تمام شعرا نے اپنی شاعری میں تشبیہات اور استعارات کا استعمال کرتے رہتے ہیں تا کہ شاعری میں خوبصورتی پیدا ہو سکے ۔ غالب نے قدیمی تشبیہات واستعارات کی بجائے جدید تشبیہات استعمال کی ہیں۔ حمیدہ شاہین نے بھی ان تشبیہات واستعارات کو اپنے اشعار میں شامل کر کے ان کو خوبصورت بنانے کی کوشش کی ہے۔

وحشتوں نے کھیل وہ کھیلے یہاں

پھول سے بچوں کے دل سہما دیے (۵۰)

اس میں شاعرہ نے بچوں کی نازک، پاکیزہ اور معصوم مزاجی کی وجہ سے پھولوں سے تشبیہ دی ہے۔ بچے بھی پھولوں کی طرح نرم اور پاکیزہ ہوتے ہیں۔ سماجی تباہی اور بربادی کی وجہ ماحول میں خوف وہراس پھیلا ہوا ہے۔ اس خوف وہراس کے ماحول سے بچے گھبرا کے مرجھا گئے ہیں۔

مچ گیا کہرام شہر چشم میں

خواب کس نے خون میں نہلا دیے (۵۱)

اس میں شاعرہ نے شہر چشم کو سماج سے تشبیہ دی ہے اور خواب کو خواہشات سے تشبیہ دی ہے ہے کہ سماج میں شعور ہونے کے باوجود لوگ غلط کام کرتے ہیں۔ شاعرہ نے یہاں سماج میں اخلاقی اقدار کی پستی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہ دل ہے کہ چاند کی مانند روشن

یہ ذرہ آسمانوں پر سجاؤ(۵۲)

اس میں شاعرہ نے چاند کی روشنی کو دل کی روشنی سے تشبیہ دی ہے۔ وہ دل کیفیت کو بیان کرتی ہے۔ وہ دل کی روشنی کو باہر کی روشنی سے تشبیہ دیتی ہے۔

ہو نظر کے سامنے جب ذرہ خاک وطن

ضوفشاں، مہتاب اور تاباں ستارے ہیچ ہیں(۵۳)

اس شعر کے آخری مصرعے میں ضوفشاں، مہتاب اور درخشاں اپنے حقیقی اور استعارتی دونوں معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ حمیدہ شاہین نے ضوفشاں، مہتاب اور درخشاں ستاروں سے مراد ان ترقی یافتہ ممالک کو لیا ہے۔ جن کی ترقی نے تمام دنیا کی نگاہوں کو چکا چوند کر رکھا ہے۔

ایک دن تو پڑھ رہی ہو گی صلوۃ آبرو

زندگی کرتی رہے گی خون سے کب وضو(۵۴)

اس شعر کے پہلے مصرعے میں صلوۃ آبرو جبکہ دوسرے مصرعے میں وضو استعارے ہیں۔ اس شعر میں سہمی ہوئی زندگی کی کیفیت نظر آتی ہے۔ ان استعاروں کے ذریعے شاعرہ نے بربریت کی فضا کو پیش کیا ہے۔

تلمیحات (صنعت تلمیح):۔

نظم و نثر میں چند مختصر الفاظ کے ذریعے کسی مخصوص روایت، واضح یا تاریخی سانح کی طرف اشارہ کرنا صنعت تلمیح کہلاتا ہے۔ تلمیح کا تعلق کسی قصے یا واقعے کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کے استعمال سے کلام میں معنویت پیدا ہوتی ہے۔ حمیدہ شاہین کی غزلوں میں ہمیں تلمیحات کا خوبصورت استعمال ملتا ہے لیکن انھوں نے تلمیحات کا استعمال بہت کم کیا ہے۔

میرے لشکر کا خدا یا یہ کیسا امتحان

کوئی طارق بھی نہیں اور جل رہی ہیں کشتیاں (۵۵)

اس شعر میں طارق بن زیاد کے واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ طارق بن زیادہ کے حکم پر تمام کشتیاں جلا دی گئی تھیں۔ کیونکہ اس کو اللہ تعالی اور اپنے قوت بازو پر مکمل یقین تھا جبکہ آج ہم اتنا پستی میں گر گئے ہیں کہ ہمارا توکل اور ایمان کمزور بلکہ ختم ہو گیا ہے۔ ہمارے سماج میں نہ کوئی طارق ہے نہ ہی لوگوں کو اپنی قوت بازو پر یقین ہے۔

غلطی ایک ہی بے ساختہ ہر بار ہوئی

سنوت کی انٹی پہ یوسف کی خریدار ہوئی (۵۶)

اس شعر میں حضرت یوسف علیہ السلام کی خریداری والے واقعے کا ذکر کیا گیا ہے کہ ایک بڑھیا نے سنوت کی انٹی کے بدلے حضرت یوسف علیہ السلام کا مول لگایا جبکہ حضرت یوسف علیہ السلام بہت خوبصورت تھے۔ یہاں شاعرہ نے اس تلمیح کے ذریعے غرور اور تکبر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ہمیں اپنی کسی بھی چیز پر غرور نہیں کرنا چاہیے۔ غرور انسان کو ذلیل کر دیتا ہے۔

اہل دل نکلے چمک کر ید بیضا کی طرح

زندگی رات سے جب بر سر پیکار ہوئی (۵۷)

اس شعر میں حضرت موسی علیہ السلام کے ہاتھ کی کرامات کے حوالے سے تلمیح نظر آتی ہے جبکہ شاعرہ نے اس شعر کو زندگی کے تناظر میں دیکھا ہے۔ زندگی جب جبر سے لڑتی ہے، انسان جب ہمت اور محنت کرتا ہے۔ کسی چیز کے حصول کے لیے تو اللہ تعالی اس کے لیے راہیں آسان کر دیتا ہے۔

عصائے حرف کی ضربیں مسلسل آزمانی ہیں

کسی پتھر سے ممکن ہے کبھی پانی نکل آئے(۵۸)

اس شعر میں حضرت موسی علیہ السلام کے عصاء کا ذکر کیا گیا ہے۔ شاعرہ چاہتی ہے کہ الفاظ کی طاقت کو اس طریقے سے بروئے کار لایا جائے کہ ممکن ہے کہ بگڑی ہوئی قوم لفظوں کی طاقت سے سدھر جائے۔ الفاظ آدمی میں جوش پیدا کرتے ہیں۔ ماضی میں بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ کس طرح رجائیہ الفاظ نے لوگوں میں جوش پیدا کیا اور وہ میدان جنگ سے فتح یاب ہو کر لوٹے۔

صنائع بدائع:۔

بدیع عربی کا لفظ ہے جو ادبی اصطلاح کے طور پر مروج ہے۔ علم بدیع میں کلام کی لفظی اور معنوی خوبیوں کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ علم بدیع کے ذریعے کلام میں خوبیاں اور دل کشی پیدا کی جاتی ہے۔ کلام میں حسن و خوبی پیدا کرنے کے مختلف طریقوں کو صنائع کہتے ہیں۔

حمیدہ شاہین نے اپنی غزلیات میں مختلف صنائع استعمال کیے ہیں جن میں صنعت تجنیس، صنعت تکرار، صنعت ابہام، صنعت مراعاۃ النظیر قابل ذکر ہیں۔

الف۔ صنعت تجنیس:۔

صنعت تجنیس کلام میں دو ایسے الفاظ کا استعمال ہے جو ایک جیسے ہوں لیکن معنوں میں مختلف ہوں یعنی مترادفات کے استعمال سے کلام میں رعنائی پیدا کرنا حمیدہ شاہین نے اس صنعت کو کم و بیش ہی استعمال کیا ہے۔

ہر گلی پہنچتی ہیں اس چمن کی خوشبوئیں

جس چمن کے پھولوں پر سخت پہرے ہوتے

ہیں[۵۹]

اس شعر میں "چمن" صنعت تجنیس ہے۔ پہلے مصرعے میں چمن سے مراد باغ ہے جبکہ دوسرے مصرعے میں چمن کا لفظ گھر کے لیے استعمال ہوا ہے۔

ب۔ صنعت تکرار:

کلام میں کسی ایک لفظ کو تاکید دینے کے انداز میں بار دیگر استعمال میں لایا جائے یعنی کسی شعر کے مصرع میں ایک ہی لفظ دہرایا جائے یا بار بار لکھا جائے۔ وہ صنعت تکرار کہلاتا ہے۔

حمیدہ شاہین کی غزلوں میں اس صنعت کا کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً:

مرے زخم زخم وجود کو نہ سمیٹ میرے عزیز اب

یہ لہو کی خوشبو عجیب ہے ترے انگ انگ سے آئے گی[۶۰]

اس شعر کے دونوں مصرعوں میں صنعت تکرار سے حسن و تاثیر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ "زخم زخم وجود" دکھ اور اذیت کی انتہائی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اور "انگ انگ" کی تکرار تسکین کا احساس دلاتی ہے۔

ج۔ صنعت ایہام:۔

کلام میں ایسے لفظ کو استعمال میں لانا جو دو معنی رکھتا ہو یعنی ایک معنی قریب اور دوسرے معنی بعید ہوتے ہیں۔ صنعت ایہام کہلاتا ہے۔ حمیدہ شاہین نے اپنی غزلوں میں صنعت ایہام کو بھی استعمال کیا ہے۔

ترا نام تارہ، گلاب، خوشبو، کرن، ضیا

مرا سائبان، مری ردا، مری روشنی[۶۱]

اس شعر کے پہلے مصرعے میں ضیا کا لفظ صنعت ابہام ہے۔ ضیا کے لغوی معنی روشنی کے ہیں۔ شاعرہ نے ماہرانہ انداز میں ضیا کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کو ہم روشنی کے معنوں میں دیکھ سکتے ہیں جبکہ شاعرہ کے شوہر کا نام بھی ضیا ہے تو ہم اسے محبوب کے تناظر میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔

د۔ صنعت تضاد:۔

کلام میں دو ایسی چیزوں کا ذکر کرنا جو معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے کی ضد ہوں جیسے دن کی ضد رات، صبح کی شام اور زندگی کی موت ہے۔ حمیدہ شاہین نے بھی اپنی غزلوں میں اس صنعت کا استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر:

میرا ہتھیار مری خاموشی

صبر کو میں نے اپنی ڈھال کیا(۶۲)

کر بیٹھے ہیں خود آگاہی کا دعوی

سب سے بڑھ کر خود سے ہم انجان بھی ہیں(۶۳)

ر۔ صنعت مراعاۃ النظیر:۔

کلام میں چند ایسی چیزوں کا ذکر کرنا جن میں تضاد کے سوال کسی قسم کی مناسبت ہو یعنی اس کے متعلق دیگر اجزاء کا ذکر بھی ساتھ کیا جائے جیسے باغ کے ذکر کے ساتھ گل، بلبل، بہار، خزاں اور ندی وغیرہ کا ذکر کرنا۔ حمیدہ شاہین نے اپنی غزل میں صنعت مراعاۃ النظیر کا استعمال کر کے اس میں رعنائی پیدا کی ہے۔ مثلا:

ہر پرندہ ہو چلا ہے اس جنوں میں مبتلا

سارے گلشن میں رہے بس ایک میرا آشیاں(۶۴)

چھیڑی اس نے بات، مہک اٹھی محفل

لہجہ نرم صبا سا، لفظ گل تازہ[۶۵]

پیام موسم گل ہو مرا کلام اگر

نگاہ غنچہ نو، شوق سے پڑھے گی مجھے[۶۶]

ہے رشتہ دل و جان کا پھولوں سے، صبا سے

ساتھی مرے بچپن کے ہیں مہر و مہ و انجم[۶۷]

حوالہ جات

۱۔ شاہد بخاری، مضمون مشمولہ ماہنامہ ادب لطیف لاہور، مئی ۲۰۰۴ء، ص ۱۳۶

۲۔ مبشرہ علی، حمیدہ شاہین کی شعری جہات، کتاب محل لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۸

۳۔ عابد حسین، کتابی سلسلہ "ارتقاء" کراچی، شمارہ ۴۲، جنوری ۲۰۰۷، ص ۱۸۰

۴۔ شفیق احمد خاں، ماہنامہ "تخلیق"، لاہور، شمارہ ۸، اگست ۲۰۰۶ء، ص ۱۳۵

۵۔ امجد طفیل، ماہنامہ "انگارے" ملتان، سلسلہ نمبر ۵۷، جنوری ۲۰۰۷ء، ص ۳۰

۶۔ افتخار عارف، فلیپ دشت وجود، ملٹی میڈیا افیئر، جنوری ۲۰۰۶ء

۷۔ حمیدہ شاہین، دشت وجود، ملٹی میڈیا افیئر، لاہور، جنوری ۲۰۰۶ء

۸۔ ایضاً

۹۔ ایضاً، ص ۱۹۰

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۵

۱۲۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، رفتہ و آئندہ، یورپ اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۱۷۷

۱۳۔ حمیدہ شاہین، دشت وجود، ملٹی میڈیا افیئر، لاہور، جنوری، ۲۰۰۶، ص ۱۴

۱۴۔ ایضاً

۱۵۔ حمیدہ شاہین "دستک" کتاب نما، لاہور، جنوری ۱۹۹۵، ص ۱۵

۱۶۔ ایضاً، ص ۵۰

۱۷۔ ایضاً، ص ۵۳

۱۸۔ حمیدہ شاہین، دشت وجود، ملٹی میڈیا افیئر، لاہور، جنوری ۲۰۰۶ء، ص ۱۶۱

۱۹۔ شفیق احمد خاں، مضمون، دشت وجود "مشمولہ"، تخلیق، اگست، ۲۰۰۶ء، ص ۲

۲۰۔ حمیدہ شاہین، دستک، کتاب نما لاہور، جنوری ۱۹۹۵ء، ص ۱۷۱

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۷

۲۲۔ حمیدہ شاہین، دشت وجود، ملٹی میڈیا افیئر، لاہور، جنوری ۲۰۰۶ء، ص ۸۹

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۰۱

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۰۲

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۱۲

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۴۸

۲۷۔ ایضاً، ص ۶۷

۲۸۔ حمیدہ شاہین، دستک، کتاب نما، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۱۰۰

۲۹۔ حمیدہ شاہین، دستک وجود، ملٹی میڈیا افیئر، لاہور، جنوری ۲۰۰۶ء، ص ۴۷

۳۰۔ ایضاً، ص ۸۸

۳۱۔ ایضاً ص ۷۵

۳۲۔ ایضاً، ص ۸۸

۳۳۔ حمیدہ شاہین، دستک، کتاب نما، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۲۷

۳۴۔ ایضاً، ص ۳۰

۳۵۔ ایضاً، ص۱۱۵

۳۶۔ ایضاً

۳۷۔ حمیدہ شاہین، دشت وجود، ملٹی میڈیا افیئر، لاہور، جنوری۲۰۰۶ء، ص۱۴۸

۳۸۔ مبشرہ علی، حمیدہ شاہین کی شعری جہات، کتاب محل، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص۱۳۲

۳۹۔ حمیدہ شاہین، دستک، کتاب نما، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص۱۱۸

۴۰۔ ایضاً

۴۱۔ حمیدہ شاہین، دشت وجود، ملٹی میڈیا افیئر، لاہور، جنوری۲۰۰۶ء، ص۵۳

۴۲۔ ایضاً، ص۸۰

۴۳۔ ایضاً، ص۱۵۲

۴۴۔ حمیدہ شاہین، دستک، کتاب نما، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص۲۸

۴۵۔ ایضاً، ص۲۳

۴۶۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، رفتہ و آئندہ، پورپ اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص۱۷۵

۴۷۔ ایضاً

۴۸۔ حمیدہ شاہین، دشت وجود، ملٹی میڈیا افیئر، لاہور، جنوری۲۰۰۶ء، ص۱۲۹

۴۹۔ ایضاً، ص۱۷۰

۵۰۔ ایضاً، ص۱۰۲

۵۱۔ ایضاً، ص۱۰۱

۵۲۔ ایضاً۱۴۷

۵۳۔ ایضاً، ص۳۵

۵۴۔ ایضاً، ص۶۳

۵۵۔ حمیدہ شاہین، دستک، کتاب نما، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص۱۱۵

۵۶۔ حمیدہ شاہین، دشت وجود، ملٹی میڈیا افیئر، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص۴۷

۵۷۔ ایضاً

۵۸۔ ایضاً، ص۳۶

۵۹۔ حمیدہ شاہین، دستک، کتاب نما، لاہور ۱۹۹۵ء، ص۳۳

۶۰۔ ایضاً، ص۱۱۴

۶۱۔ ایضاً ص۱۴۴

۶۲۔ حمیدہ شاہین، دشت وجود، ملٹی میڈیا افیئر، لاہور، جنوری ۲۰۰۶ء۔ ص۱۳۴

۶۳۔ حمیدہ شاہین، دستک، کتاب نما لاہور، ۱۹۹۵ء، ص۱۰۰

۶۴۔ ایضاً، ص۱۱۵

۶۵۔ حمیدہ شاہین، دشت وجود، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، جنوری ۲۰۰۶ء، ص۵۲

باب سوم:

حمیدہ شاہین کی نظم میں سماجی شعور

(دستک اور زندہ ہوں کے حوالے سے)

نظم عصرِ جدید کی مقبول ترین صنف ہے اور حمیدہ شاہین نے غزل کے ساتھ ساتھ نظم میں بھی طبع آزمائی کی اور اپنا منفرد مقام بنایا۔ اس لیے ان کو ایک صنفی شاعرہ نہیں کہا جاسکتا۔ حمیدہ شاہین نے غزل اور نظم دونوں اصناف کے موضوعات کی توسیع کی ہے، انہوں نے اپنی نظموں میں بہت سے تجربات کیے ہیں۔ ان کی نظموں کے موضوعات کو اگر دیکھا جائے تو ان کے ہاں سماجی زندگی کے پہلو نمایاں موضوعات کی صورت میں نظر آتے ہیں وہ زندگی کے خارجی اور باطنی پہلوؤں کے علاوہ سماجی حالات و واقعات کی عکاسی کرتی نظر آتی ہیں۔ ان کی نظم میں سماجی فکر و سماجی کرب کا اظہار ملتا ہے۔ ان کی نظموں کے موضوعات انفرادیت رکھتے ہیں، جو انہیں دوسرے شعراء سے منفرد بناتے ہیں۔

آفتاب اقبال شمیم رقم طراز ہیں:

> "حمیدہ شاہین کی یہ نظمیں اپنی تفہیم میں آسان بھی ہیں مشکل بھی، آسان اس لیے کہ یہ نظمیں روزمرہ کی منطق میں اپنے مدعا کی براہ راست ترسیل کرتی ہیں مشکل اس لیے کہ یہ ایک وسیع تر تناظر میں زندگی کے بارے میں سوچتی بھی ہیں ان نظموں میں ادھ کترے لفظوں کے مکمل ہونے اور روندے کچلے حرفوں کے ڈھیر سے معنی کی بازیافت کا خواب دیکھتی ہے وہ بہرے گونگے آج کے بنجر سے ایک زرخیز کل کے نمو کی تمنا کرتی ہے"۔[1]

حمیدہ شاہین کی نظموں میں حقیقت پسندی اور سماجی مسائل نظر آتے ہیں جو کہیں تفہیم کے لحاظ سے مشکل ہیں اور کہیں تفہیم کے لحاظ سے آسان ہیں۔ حمیدہ شاہین نہایت سادگی سے اپنے ارد گرد کے موضوعات اور سماج میں ہونے والی ناانصافیوں کو اپنی نظموں میں سموتی نظر آتی ہیں۔ ان کی نظمیں جتنی سادہ نظر آتی ہیں اتنی ہی معنوی لحاظ سے ان میں وسعت اور گہرائی نظر آتی ہے۔ حمیدہ شاہین کے لہجے میں بے باکی کی

بجائے شائستگی اور متانت نظر آتی ہے اور ان کی نظموں میں آنے والے واقعات اور واردات کتنی ہی سنگین کیوں نہ ہو ان کے ہاں تلخی کی بجائے سنجیدگی نظر آتی ہے۔ موجودہ دور کی زندگی اور مسائل کے بارے میں ان کے ہاں گہری سوچ اور فکر نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر سیتہ پال آنند رقم طراز ہیں:

"حمیدہ شاہین البتہ ہمہ صفت شاعرہ ہیں اور وہ صرف من و تو کے دائرے کے اندر رہ کر ہی اپنی نظموں کی تخلیق نہیں کرتی۔ اس مالم وماعلیہ کی جہات تعداد میں زیادہ نہیں ہیں اور شاعرہ اس کے اندر رہ کر بھی اور اس سے باہر آکر بھی اس کی گوناگوں شخصی، ازدواجی اور سماجی سچائیوں کو تلاش کرتی ہیں" (۲)

ان کے ہاں سماج میں عورت کے مقام، اس کی عزت نفس کی نفی، ان سے روا رکھے جانے والے امتیازی اور اس کے وجود سے انکاری کے رویے کے متعلق ان کی نظموں میں موضوعات بڑے واضح انداز میں نظر آتے ہیں۔ حمیدہ شاہین اپنی نظموں میں سماجی سچائیوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کی نظموں میں ان کے اندر کا وجود شعور اور لاشعور دونوں سطحوں پر منعکس ہوتا ہے۔ سرور امان حمیدہ شاہین کی نظموں کے بارے میں یوں بیان کرتے ہیں:

"موضوعات کے لحاظ سے وہ حقیقت پسند ہیں وہ اپنی فراموش کردہ ثقافت کو بھی شاعری میں جگہ دیتی ہیں اور جدید انسانی رویوں، وارداتوں اور عصری تقاضوں کو بھی موضوع سخن بناتی ہیں یہ کہنا بے جانہ ہو گا کہ حمیدہ شاہین کی شاعری نہ عامیانہ ہے نہ سادہ اسلوب بیان سے ہمکنار ہے" (۳)

حمیدہ شاہین کی نظموں میں کہیں کہیں طاقت اور رجائیت اپنا احساس دلاتی ہے۔ ان کی نظموں میں عمومی رواج کے مطابق محض انفرادی اظہار ہی نہیں بلکہ سماج میں بھی پسی ہوئی زندگی کو سمجھنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں ایسی نظمیں موجود ہیں جو سماجی شعور کی عکاس ہیں۔ ان نظموں میں شاعرہ نے استعاراتی اور تمثیلی انداز میں ہمارے سماجی پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے، انہوں نے سماج میں بسر ہونے والی

زندگی کی تصویر کشی کی ہے۔ حمیدہ شاہین کے ہاں زندگی اور سماج میں گہرا ربط ہے۔ حمیدہ شاہین کی نظموں میں تخلیقی ہنر مندی نمایاں ہیں۔ڈاکٹر شمیم حنفی حمیدہ شاہین کی نظموں کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"ان میں حیران کن سریّت کے عناصر کی موجودگی انھیں حقیقت پسندی کی عامیانہ سطح سے اوپر اٹھاتی ہے اس کے ساتھ ساتھ ان نظموں میں زندگی کی مانوس اور بیرونی سطح پر رونما ہونے والے تجربوں کا عکس بھی نمایاں ہے، گویا کہ وہ ایک ساتھ اپنی ہستی کے دو دائروں میں گردش کر رہی ہیں، پہلا دائرہ ایک ماورائی اور مابعد الطبیعاتی اساس رکھتا ہے دوسرا دائرہ روزمرہ زندگی کی سچائیوں کا احاطہ کرتا ہے"(۴)

حمیدہ شاہین کا پہلا مجموعہ "دستک" ہے جو عام طور پر غزلوں کا مجموعہ کہلاتا ہے۔ لیکن شاعرہ نے اس مجموعہ کلام میں ہر دس بارہ غزلوں کے بعد نو، دس نظمیں درمیان میں رکھی ہیں۔ چونکہ نظمیں اور غزلیں الگ الگ نہیں ہیں اس لیے یہ باری باری آتی ہیں۔ دستک کی نظموں میں ذہنی شعور نمایاں ہے۔ان کے ہاں ذہنی اور روایتی شعور مل کر نئی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ انجم رومانی لکھتے ہیں:

"حمیدہ شاہین کی شاعری پڑھ کر لگتا ہے کہ وہ ان شاعروں میں سے ہے جو زندگی کو اپنے دور کے بدلے ہوئے زاویے سے دیکھتے ہیں اور اپنے خاص انداز سے اس کا اظہار کرتے ہیں وہ ایک بالکل مختلف وژن کی شاعرہ ہے اس کے شعر روایت سے منسلک رہتے ہوئے جدت کے حامل ہیں اور یہ جدت نئے دور کی طرز احساس سے پیدا ہوئی ہے"(۵)

"زندہ ہوں" نظموں کا مجموعہ ہے یہ حمیدہ شاہین کا تیسرا مجموعہ کلام ہے اور یہ (۲۰۱۰) میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعہ کلام میں (۱۰۳) نظمیں شامل ہیں۔ اس مجموعے میں شاعرہ کی ہنر پر گرفت دکھائی دیتی ہے۔ شاعرہ ہر نظم کی آخری دو تین سطروں میں سچ کا بے ساختہ اظہار کرتی نظر آتی ہیں۔"زندہ ہوں" میں ایسی نظمیں واضح طور پر نظر آتی ہیں جن میں ہمیں سماجی شعور کی عکاسی نمایاں ہے۔

غلام حسین ساجد اپنے مضمون "روئے اسی وی آں" میں رقم طراز ہیں:

"زندہ ہوں" ایک ایسی کتاب ہے جو صرف اس طرح کے معاشرے میں لکھی جاسکتی ہے کہ جس کے معاشرے میں ہم زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں اور جس کا زہر ہماری رگوں میں دوڑتا ہے۔۔۔۔ "زندہ ہوں" ان چند کتابوں میں سے ایک ہوگی جو پاکستانی معاشرے کی درست تصویر کشی اور نمائندگی کرتی ہے کیوں کہ اس کتاب میں دکھنے والی تصویریں اور رنج صرف اس معاشرے کا شاخسانہ ہو سکتے ہیں اور ان کے ظاہر اور باطن سے ہمارے لہو اور مٹی کی خوشبو کھل کر آتی ہے"(۶)

حمیدہ شاہین کی نظموں کے مجموعے "زندہ ہوں" میں معاشرتی رویوں، رجحانات اور فکری پہلوؤں کا عکس جھلکتا ہے۔ ان کی نظمیں ہیت کے اعتبار سے شعوری کاوش کی بجائے فطری بہاؤ میں مکمل ہیں۔ اسی طرح حماد نیازی حمیدہ شاہین کی کتاب "زندہ ہوں" پر تبصرہ کرتے نظر آتے ہیں:

"حمیدہ شاہین کی نظموں کا مجموعہ "زندہ ہوں" کی زندگی کا اگر کوئی بڑا ثبوت نہ بھی ہو تو معاشرے کے رویوں کا جس طرح انھوں نے باطنی سطح پر جا کر اظہار کیا ہے، وہ اس کتاب کی اہمیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان نظموں سے جو امکانات نکلتے نظر آرہے ہیں اور ان امکانات سے جن رجحانات کی عکاسی ہوتی نظر آرہی ہے۔ وہ اس فکری اور تخلیقی تشخص کی آبیاری کرتے نظر آتے ہیں، جس میں زندگی کے دروبست اور زندگی کو باطنی سطح پر پرکھنے کی بے پناہ طاقت نظر آتی ہے۔"(۷)

(ب) حمیدہ شاہین کی نظم میں سماجی شعور:۔

دستک اور زندہ ہوں کے حوالے سے حمیدہ شاہین کی نظموں کے موضوعات پر بات کی جائے تو ان کی نظموں میں سماجی شعور کا بھرپور عکس ہے۔ ان کی نظموں کے اہم ترین موضوعات میں رسم رواج، طبقاتی تقسیم، عورت کا مقام، جبر و استحصال، سماجی زندگی کے مسائل، انسانی رویے، مشرقیت اور اخلاقی اقدار وغیرہ ہیں۔

ا۔ رسم ورواج:۔

کسی بھی سماج کی تشکیل کے لیے مذاہب، جغرافیائی حالات اور وہاں کے وسائل اہم ہوتے ہیں اس لیے کسی بھی سماج کے رسم ورواج میں ان عناصر کے عکس کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ سماجی رسوم ورواج معاشی ،مذہبی اور جغرافیائی حالات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ سماجی رسم و رواج سماجی نظام فکر ،خوراک ،لباس اور دوسرے فنون کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ جغرافیائی حالات کا رسموں ورواجوں پر بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ ہر جغرافیے کے حالات مختلف ہوتے ہیں اس لیے رسم ورواج علاقوں کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں ۔ سماجی تبدیلوں کے ساتھ رسم ورواج میں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ آج جدید دور میں بھی کچھ رسم ورواج ایسے ہیں جو قدیم دور اور جدید دور میں یکساں پائے جاتے ہیں۔

حمیدہ شاہین کی نظموں میں رسم ورواج سے متعلق اشعار ملتے ہیں جن میں وہ سماج میں رائج رسم ورواج کو بیان کرتی ہیں اوران کے اظہار سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہمارے سماج میں ارد گرد کے انسان کس طرح رسم و رواجوں میں جکڑے ہوئے ہیں اور یہ رسم ورواج کس حد تک انسانی زندگی پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔

کچھ ایسا جادو کیے دے رہی تھی شہنائی
حواس میں تھی میری ماں،نہ ہوش میں بھائی
مجھے روانہ کیا سب نے اتنی جلدی میں
نہ دن کا چین سمیٹا،نہ نیند رکھ پائی
وہیں کہیں مرے ساماں سے گر گیا بچپن
میں کھلکھلاتی ہنسی بھی وہیں پہ بھول آئی
کسی کا ناز کسی کی ادا تھی پاس مرے
سہیلیوں کو کوئی چیز بھی نہ لوٹائی
مرے سرہانے پڑے رہ گئے خیال مرے

جو خواب سینت کے رکھے تھے وہ بھی کب لائی

کہانیوں کی پری نے بھی پھیر لیں آنکھیں

چھڑی گھمائی کسی نے نہ کی مسیحائی

نہ جانے مٹھی میں کس نے تھما دیے آنسو

نجانے جلدی میں کس کا نصیب اٹھا لائی

ان عجلتوں کا نتیجہ نجانے کیا نکلے

نجانے کس طرح ہوگئی مری پذیر(۸)

شاعرہ نے نظم "عجلت گزیدہ" میں نہایت ہی ماہرانہ طریقے سے رسم ورواج کی تصویر پیش کی ہے کہ کس طرح انسانی احساسات وجذبات کی پرواہ کیے بغیر ہمارے سماج میں قائم رسم ورواج کو اہمیت دی جاتی ہے۔ انسانی جذبات واحساسات سے کھیلنے کو بھی مضحکہ خیز نہیں سمجھا جاتا اس نظم کو اگر دیکھا جائے تو یہ شادی کی رسومات کے بارے میں اور اس کے ارد گرد کے لوگوں کی سوچ کی واضح عکاسی کرتی ہے کہ جب کسی لڑکی کی شادی ہونے لگتی ہے تو اس کے گھر والوں کو ہر کام کی جلدی ہونے لگتی ہے۔ اس لڑکی کے احساسات وجذبات کوئی معنی نہیں رکھتے۔ عورت ہمیشہ ہی رسم ورواج میں پس جاتی ہے۔ ان کی قسمت کا کسی کو بھروسہ نہیں ہوتا کہ نجانے کب کہاں قسمت دھوکہ دے جائے کیوں کہ جو کام جتنی جلدی میں کیا جاتا ہے نصیب بعض دفعہ اس میں اتنا ہی فریب دیتا ہے۔

ہمارا دامن و دستِ دعا ہر پل کُشادہ ہے

کبھی بھائی، کبھی شوہر، کبھی فرزند کی خاطر

ہمارے خون سے ہر گُزر کو سُرخ کر کے بھی

ہمیں مانا نہیں جاتا

ہم اپنے دل کے دروازوں پہ استادہ ہیں صدیوں سے

کوئی آہٹ، کوئی جھونکا ہماری روح میں اُترے

ہمارا نام لے کوئی، ہمیں پہچان لے کوئی

ہمیں بھی مان لے کوئی[۹]

حمیدہ شاہین نے نظم "گلہ وفائے جفا نما" میں ونی کی رسم کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہمارے سماج میں عورت کو باپ، بھائی، بیٹوں، کے سر کے بدلے کس طرح ونی کر دیا جاتا ہے۔ باپ اور بھائیوں کی زندگی بچانے کے لیے عورت کی ساری زندگی اس رسم کی بھنیٹ چڑھ جاتی ہے۔ عورت کے کسی حق کے بارے میں اچھا گمان بھی نہیں رکھا جاتا۔ آخری بند میں شاعرہ کسی انجان امید کے انتظار میں ہیں۔ کوئی تو ایسا آئے جو عورت کو رسم ورواجوں سے بالاتر ہو کے تسلیم کرے۔

طبقاتی تقسیم:۔

انسانی سماج مختلف گروہوں، طبقوں اور اصناف میں تقسیم ہے انسان کا مختلف طبقوں میں تقسیم ہونے کا مطلب بنیادی اصول حاکمیت ہے۔ ابتدائی سماج، ہر قسم کی تقسیم، تضاد، طبقات اور ناہمواریوں سے پاک تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا انسانی سماج طبقوں میں تقسیم ہوتا گیا۔ طبقاتی تقسیم کسی بھی سماج کے لیے ناگزیر ہے۔ لیکن یہ تقسیم کسی بھی سماج میں موجود مخصوص نظام فکر کے تحت پیدا ہوتی ہے۔ ہمارے سماج میں طبقاتی تقسیم کی جڑیں نہایت پرانی ہیں۔ طبقاتی تقسیم ہندوستان کے دور سے نظر آتی ہے۔ علی عباس جلالپوری اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "ہمارے ہاں جاگیر دار اور صنعت کار اعلیٰ طبقے میں شمار ہوتے ہیں اور تاجر مزراعہ (یوسف زئیوں کے علاقے مزارعین کو فقیر کہا جاتا ہے) اور اہل حرفہ کا مرتبہ کمتر ہے اہل حرفہ کو کمین یا کمینہ (لغوی معنی کام کرنے والا) کہتے ہیں ان میں لوہار، ترکھان، موچی، نائی، کمہار، ماچھی وغیرہ شامل ہیں"[۱۰]

حمیدہ شاہین کی نظموں کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انہوں نے سماج میں ہونے والی طبقاتی تقسیم کو موضوع بنایا اور اس تقسیم کے خلاف اپنی آواز بلند کی ہے۔ ان کی نظموں میں طبقاتی تقسیم سے سماجی نظام پر ہونے والے مضر اثرات کا عکس نظر آتا ہے کہ طبقاتی تقسیم کس حد تک، کس طرح، کیوں کر اور کہاں تک معاشرتی زندگی پر اثر انداز ہو رہی ہے۔

درخت کاٹو

چھتیں گرا دو

کہیں کوئی سائباں نہ چھوڑو

ہمارا پیغام دے دو سورج کو

حکم ثانی تلک وہ شب کو بھی حاضری دے

غُروب ہونے کا عیش چھوڑے

کرو منادی

کہ چھانو ممنوع ہو گئی ہے

خیال رکھو

کہ یہ ہماری ہے راج دھانی

یہاں فقط ہو

ہمارا سایہ (۱۱)

حمیدہ شاہین نے نظم "ظل سبحانی" میں امراء طبقے کے بارے میں بیان کیا ہے کہ امراء طبقہ سماج میں اس طرح حاوی ہو گیا ہے کہ دوسرے طبقوں کی کوئی حیثیت نہیں رہی۔ سرمایہ دار اور جاگیر دار طبقہ جب چاہتا ہے۔ کسی کو بھی بے گھر کر دیتا ہے۔ کسی کا بھی آسراء چھین لیتا ہے۔ ان پر آواز اٹھانے والا کوئی نہیں ہوتا۔ یہ

لوگ خود کو خدا سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ یہ طبقہ چاہتا ہے کہ سماج کا ہر اصول ان کے حکم کا پابند ہو جہاں بھی کوئی کام ہو پہلے ان کی اجازت طلب کی جائے۔ حمیدہ شاہین بڑے بے باک طریقے سے اس طبقے کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ اس طبقے سے وابستہ لوگوں کا بس چلے تو سماج میں رہنے والے لوگ سانس بھی ان کی مرضی سے لیں۔

عورت کا مقام:۔

ہمارے سماج میں مرد کو عورت پر فوقیت دی جاتی ہے۔ عورت اسی حیثیت سے زندگی گزار دیتی ہے۔ اس کی زندگی میں اس کا اپنا عمل دخل نہیں ہوتا نہ ہی اسے اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ ہمارے سماج میں عورت کا سماجی مقام ہر لحاظ سے کمتر ہے۔ ہمارے سماج میں عورتوں کے ساتھ غیر مساوی سلوک ہوتا ہے۔

شاہد بخاری حمیدہ شاہین کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہیں:

> "دیگر شاعرات برعکس حمیدہ شاہین نے محض نسائی موضوعات ہی کو اپنی شاعری میں نہیں برتا بلکہ مکمل تخلیقی تجربے کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنی نسائی ذات کو نظر انداز کرتی ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نسائیت سے ماوراحیات وکائنات کو بھی اپنی شاعری کو موضوع بناتی ہیں۔ نسائی موضوعات بھی ان کی شاعری میں رائج الوقت فیشن کے طور پر نہیں آئے بلکہ انھوں نے مشرقی معاشرے کے پس منظر میں نسائی وجود کو درپیش سوالات اٹھائے ہیں۔ وہ مرد کو اپنا مدمقابل نہیں سمجھتیں بلکہ اس کی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے وجود کا سوال اٹھاتی ہیں"(۱۲)

حمیدہ شاہین کی نظموں میں عورت کے مقام کے حوالے سے بہت زیادہ مثالیں ملتی ہیں۔ وہ عورت کو مرد سے کمتر نہیں سمجھتیں۔ وہ عورت کو مرد کے برابر سمجھتی ہیں اور وہ اس حیثیت کو مانتے ہوئے عورت کے مقام کے حوالے سے سوال اٹھاتی ہیں کہ عورت اس سماج میں کیا مقام رکھتی ہے اور وہ کس حیثیت سے زندگی گزار رہی ہے؟

مجھے خرقۂ غم ودِیعت ہوا ہے

وہ چادر عطا کی گئی ہے کہ جس پر

چمکتا ہے ضوریز یادوں کا ابرق

جو اپنوں کی فرقت میں رنگی ہوئی ہے

لہو رنگ اشکوں سے بھیگی ہوئی ہے (۱۳)

شاعرہ نظم "پیالے سے چھلکی ہوئی نظم" میں مشرقی دوشیزہ کے احساسات و جذبات کی منظر کشی کرتی ہیں کہ جو تمام تر غم والم کے ساتھ بے بسی کی تصویر بنی کھڑی ہے۔ اس نظم میں ہر عورت کی تقدیر کی جھلک نظر آتی ہے کہ کس طرح مشرقی ممالک میں عورت کو نچلے درجے پر رکھا جاتا ہے۔ اسے زندگی بھر دوسروں کے مرہون منت رکھا جاتا ہے۔ عورت کو انسان نہیں سمجھا جاتا ہے اور نہ ہی کسی نے اس کی روح کے غم والم کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

کیا بتاؤں تجھے

میں کڑکتی ہوئی دھوپ میں پا برہنہ کہاں تک چلی،

میں نے کتنے کڑے کوس کاٹے تو دو گھونٹ پانی ملا

کیسے میرا لہو

پانی ہو کے مساموں سے بہتا رہا

اور میں ڈھوتی رہی رنج کی گھڑیاں

کیا کہوں

کس مشقت نے ہاتھوں کو زخم اور پیروں کو چھالوں کا

تحفہ دیا

یہ مری محنتوں کی کمائی تھی

جو تیری تھالی میں ہے (۱۴)

نظم "چوری کی بھوک" میں عورت کا ایک بیٹی کی حیثیت سے جو مقام سماج میں ہے اس حوالے سے اس نظم میں ذکر ملتا ہے کہ اسے اس حیثیت سے بھی سماج میں ساری زندگی سفر در سفر چلنا پڑتا ہے۔ بیٹی کی بجائے بیٹوں کو ماں باپ کا زیادہ پیار، حق اور جائیداد دی جاتی ہے اور بیٹی کسی بھی حق کی دعوے دار نہیں ہو سکتی۔

میں ٹھنڈے توے کی روٹی ہوں

مجھے بے دھیانی میں ڈالا گیا

مجھے بے دردی سے پلٹا گیا

مرے کتنے ٹکڑے اکھڑ گئے

میں ٹھیک سینکی جا نہ سکی

میں کسی چنگیر میں آ نہ سکی

میرا پسینا، گندھنا اور جلنا

بے کار گیا، میں ہار گئی

اک بے دھیانی مجھے مار گئی (۱۵)

حمیدہ شاہین کی نظم "اک بے دھیانی" مختصر ترین نظموں میں سے ایک ہے یہ نظم عورت کی سماجی زندگی کے حوالے سے ہے کہ عورت کی ساری زندگی گردش میں رہتی ہے۔ کہیں وہ ماں، کہیں وہ بیٹی، کہیں وہ بیوی اور کہیں وہ بہو کی صورت میں پِس رہی ہے۔ اس کا اپنا کوئی وجود نہیں مانا جاتا۔ عورت چاہے کسی بھی روپ میں ہو مرد ہمیشہ اس پر مسلط رہنا چاہتا ہے۔ وہ عورت کی خود مختاری کو برداشت نہیں کر سکتا اور عورت رشتوں کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے اور انہی کے ہاتھوں مار کھا جاتی ہے۔

سن رکھوالے!

باڑے کے اندر اک کھڑکی کھلی ہوئی تھی

تیری بھیڑ نے باہر جھانکنا سیکھ لیا ہے

یہ اپنے قدموں پر سیدھا چل سکتی ہے

اس کے بازو بھی اب بوجھ اٹھا سکتے ہیں

اب یہ اپنی راہ کے پتھر چن سکتی ہے

اب تو لگتا ہے یہ پھول اگا سکتی ہے

دنیا کو مہکا سکتی ہے (۱۶)

شاعرہ نظم "درزوں سے آتی روشنی" میں عورت کے رکھوالوں سے بات کرتی نظر آتی ہیں کہ عورت زندگی کے مختلف پہلوؤں کے حوالے سے اپنا ایک الگ نقطہ نظر رکھتی ہے۔ عورت کے اندر اپنی ذات کا شعور اور اپنے الگ وجود کا شعور دن بدن پروان چڑھ رہا ہے۔ جس کی وجہ سے عورت اس حد تک خود مختار ہو چکی ہے کہ نہ صرف اپنی ذات کی ذمہ داریاں اٹھا سکتی ہے بلکہ دنیا میں اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ سے اپنے فرائض احسن طریقے سے نبھا سکتی ہے۔

خدا کی مجازی خدا پر نوازش

خدائی کا تحفہ

شریک سفر کو

غبار سفر کی طرح جھاڑنے کی اجازت (۱۷)

شاعرہ نے نظم "طلاق" میں مرد کو بطور مجازی خدا حاصل ہونے والے حقوق کے بارے میں بحث کی ہے کہ آج کل سماج میں مرد خود کو خدا کی مسند پر بیٹھا چکا ہے اور اس حق کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے اور وہ عورت کو اس میل کی طرح سمجھتا ہے کہ جو دھو لینے سے آسانی سے اتر جاتی ہے۔

حمیدہ شاہین کی بہت سی نظمیں اس موضوع پر ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر موت کا پھندا، شب خون، مائیں بوڑھی ہونا بھول چکی ہیں، ڈسپوزایبل، قدر مشترک وغیرہ شامل ہیں۔

اس کی بیٹی پر روز تالے خریدتی ہے

جگہ جگہ لگاتی ہے

اس کے پاس سنتینے اور چھپانے کو بہت کچھ ہے

شادی کے اگلے ہی روز

اس نے اپنے پندار کی کرچیاں سمیٹ کر دراز میں رکھیں (۱۸)

حمیدہ شاہین نے نظم "مجھے ورثہ نہیں ملا" میں شادی کے بعد عورت کی بدل جانے والی حیثیت کی تصویر کشی کی ہے کہ شادی کے بعد عورت کی حیثیت بالکل بدل جاتی ہے۔ اس کی زندگی والدین کے گھر جیسی نہیں رہتی۔ اس کو اپنی ازدواجی زندگی کے لیے بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ وہاں اس کو اپنی ذات کی نفی کرنی پڑتی ہے

عورت ہی بنانا تھا

تو زلفوں سے سجا ہوا سر بنا دیتا

سر میں دماغ کیوں رکھ دیا

یہاں تو خوب صورت چشم و ابرو سے کام چلنا تھا

تو نے آنکھوں میں گہرائیاں اور گہرائیوں میں اشک کیوں رکھے

غنچہ دہن بنا دیتا

دہن میں زبان اور زبان میں قوت گویائی کیوں رکھ دی (۱۹)

اس نظم "فالتو پرزوں والی گاڑی کون چلائے" میں شاعرہ اللہ سے شکوہ کرتی ہیں کہ اے اللہ تعالیٰ اگر عورت ہی بنانا تھا تو مجھے شعور کیوں دیا جس کے ہونے کی وجہ سے مجھے ہر بات محسوس ہوتی ہے۔

جبر و استحصال:۔

اردو شاعری میں جو نئے موضوعات ملتے ہیں ان میں طبقاتی تقسیم اور استحصال کے موضوعات نمایاں ہیں۔ ہمارے سماج میں حکمران طبقہ، جاگیر دار طبقہ نسل در نسل غریب کا استحصال کرتا ہے۔ یہ استحصال سماج میں رائج ہر صورت میں نظر آتا ہے۔ چاہے وہ محکمہ صحت ہو یا محکمہ تعلیم، روزگار ہو یا قانونی نظام، ہر جگہ جبر و استحصال کی واضح جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ان کو اس جبر استحصال سے روکنے والا کوئی نہیں ہے۔ شاعری اور نثر کے ذریعے کئی ادیبوں اور شاعروں نے اس کے خلاف آواز اٹھانے کوشش کی ہے۔ آفتاب اقبال شمیم کہتے ہیں:

> حمیدہ شاہین کی شاعری (جو تیسرے پڑاو پر ہے) غم کی ذاتی وارداتوں کے علاوہ اخلاقی اقدار کے انحطاط موجودہ صورت حالات کی بے معنویت، جبر و استحصال انسان کے نا انسان ہونے کے بڑھتے ہوئے عمل اور ارض تشکیک پر پلتی ہوئی سو طرح کی نا آسودگیوں اور خطروں کے بارے میں ہے (۲۰)

حمیدہ شاہین کی نظموں میں سماج میں ہونے والے جبر و استحصال کے حوالے سے موضوعات نظر آتے ہیں ان کی نظموں میں وہ تمام پہلوؤں موجود ہیں۔ جن میں سماج میں پسے ہوئے طبقات کے ساتھ استحصالی رویے، حکمران طبقے کا عوام کے استحصال کے حوالے سے ناحق خون بہانے کے حوالے سے موضوعات ملتے ہیں۔ کوئی بھی شخص جو بے گناہ کا خون بہاتا ہے وہ بچ نہیں سکتا حمیدہ شاہین نے ایسے موضوعات پر بھی قلم آزمایا ہے۔ جس کے بارے میں عام حالات میں شعراء قلم اٹھانے سے پرہیز کرتے ہیں۔

تمہیں ہم نے بتایا تھا

اسے ناحق بہاؤ گے تو یہ سر چڑھ کے بولے گا

اسے جتنا چھپاؤ گے یہ سارے بھید کھولے گا

مگر تم کو یقین کب تھا

تمھارے گرد سب گھڑیوں کی سوئیاں تھر تھراتی تھیں

تمھارے دل کے ہندسے پر

اب اس ہندسے کے باہر

دور تک پھیلے ہوئے ہیں قرمزی دھبے

تم اس روندے ہوئے پھیلاو میں بالکل اکیلے ہو

زمانہ تم سے صدیوں کی مسافت پر ہے خیمہ زن

اور اس خاکستری گھیری سے نیلے آسمانوں تک

سزائے موت ہے۔

تم ہو

معافی کی اپیلیں ہیں (۲۱)

شاعرہ نے نظم "وقت کا قصاص "میں سماج میں ہونے والی ناانصافیوں کے بارے میں بیان کیا ہے کہ جتنی بھی ناانصافیاں کی جائیں۔ وہ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی صورت میں سامنے آجاتی ہیں۔ چاہے چھپانے کے لیے کتنے ہی تردد کیوں نہ کیے جائیں۔ ہمیں جتنا بھی یقین ہو کہ ظلم کی آواز کو دبایا جاسکتا ہے تو یہ سراسر جھوٹ ہے کیونکہ جب بھی کوئی ظالم و جابر کسی بے گناہ کا ناحق قتل کرتا ہے تو اس کا لہو آواز اٹھاتا ہے۔ سماج میں جب بھی بے گناہ لوگوں کی قتل وغارت ہوتی ہے۔ وہ سامنے آجاتی ہے۔ وہ چھپانے سے نہیں چھپتی کیونکہ خون اپنے دھبے گناہ گار کے دامن پر چھوڑ کر جاتا ہے۔

درخت کاٹو

چھتیں گرا دو

کہیں کوئی سائباں نہ چھوڑو

ہمارا پیغام دے دو سورج کو

حکم ثانی تلک وہ وہ شب کو بھی حاضری دے

غروب ہونے تک عیش چھوڑے

کرو منادی

کہ چھانو ممنوع ہو گئی ہے

خیال رکھو

کہ یہ ہماری ہے راج دھانی

یہاں فقط ہو

ہمارا سایہ [۲۲]

"ظل سبحانی" شاعرہ کی نظموں میں سے واحد نظم ہے جس میں گہرا طنز، حقارت کی حدوں کو چھو رہا ہے کہ آمریت، حکمران، جاگیر دار طبقے کے زیرِ سایہ رہنے والے لوگ ان کی مرضی سے بسیں گے اور روئیں گے۔ اپنی زندگی کو اپنی مرضی سے گزارنے کی بجائے ان کی راجدھانی کے حکم کے مطابق گزاریں گے لیکن وہ لوگ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نائب ہیں، اصل تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

دل کرتا ہے اس وحشی کے

سینے میں اک خنجر ماروں

ناخن کھینچوں۔۔۔۔۔

ہاتھوں اور پیروں کی اک اک انگلی توڑوں

ہوس کی ماری آنکھیں نوچوں اور کتوں کے آگے ڈال دوں

ہڈیاں توڑ کے سرمہ کر دوں

میرے بس میں ہوتا تو میں

اس وحشی کے سارے جسم پہ

بال بال کی جڑ میں سوئیاں گاڑ کے زندہ دفن کراتی

کیوں کہ ایسے حیوانوں کو

عدم ثبوت کا فائدہ دے کر

اکثر چھوڑ دیا جاتا ہے (۲۳)

اسی طرح حمیدہ شاہین کی نظم "تین سالہ بچی کا ریپ" اپنے موضوع کے لحاظ سے منفرد ہے۔ ہم روزمرہ کی زندگی میں مختلف الیکٹرونک میڈیا اور اخبارات میں اس طرح کے واقعات پڑھتے ہیں۔ لیکن جو تاثر ہمیں ان کی نظم میں ملتا ہے۔ شاید ہی ایسا کوئی انسان ہو جس کے دل و دماغ میں وہ موجود نہ ہو لیکن وہ اپنی زبان پر لانے سے کتراتے ہیں۔

مجھے سب نے بتایا ہے

کہ میں ان ڈور پودا ہوں

مگر اس حبس میں کچھ تو ہوا درکار ہے سائیں

کہ پودا باغ میں ہو یا کسی گملے کے پنجرے میں

اسے بھی سانس لینا ہے

مرے سائیں! ضروری ہے بہت دو گھونٹ پانی بھی

جڑیں پیاسی ہوں تو شاخوں پہ ہریالی نہیں رہتی

نئی کونپل نہیں آتی

دمکتے سبز پتے زرد پڑ کر سوکھ جاتے ہیں

سنا ہے روشنی بھی لازمی عنصر ہے جینے کا

اندھیرے کا تسلسل زندگی کو چاٹ جاتا ہے

مجھے بھی زندہ رہنے کو ضیاء درکار ہے سائیں

ہوا درکار ہے سائیں (۲۴)

حمیدہ شاہین کی نظم "ان ڈور پلانٹ" کو اگر دیکھا جائے تو انھوں نے اس نظم میں نہایت ہی منفرد اور مختلف استعارہ "ان ڈور پلانٹ" استعمال کیا ہے کہ جس طرح کمرے یا گھر میں موجود پودے کو پانی، دھوپ اور ہوا کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح عورت کو بھی زندگی گزارنے کے لیے ان چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیوں کہ اگر پودوں کو دھوپ اور ہوا کے بغیر رکھا جائے تو ان میں زندگی کی رمق ختم ہو جاتی ہے۔ اس میں شاعرہ "سائیں" کا لفظ مالک کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔ سائیں کے دو مطلب ہیں۔ اس کو حقیقی خدا کے حوالے سے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور مجازی کے حوالے سے بھی۔ عورت کو اگر مسلسل قید میں رکھا جائے تو وہ بھی پودوں کی طرح مرجھا جاتی ہے۔ اس میں زندہ رہنے کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔

سماجی زندگی کے مسائل:۔

شاعری اور سماج میں گہرا تعلق ہے۔ شاعری سماج کو روشنی عطا کرتی ہے جبکہ سماج شاعری کو نئے نئے موضوعات اور عنوانات فراہم کرتا ہے۔ شاعری سماج سے متاثر ہوتی ہے۔ شاعری سماج کی گتھیوں کو سلجھانے کے ساتھ ساتھ مسائل کی تہہ تک پہنچنے میں مدد دیتی ہے اور ان مسائل کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا کرتی ہے اور ان کو حل کرنے کے نئے طریقے اور راستے بتاتی ہے۔ شاعری کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ سماج سے آنکھیں نہ پھیرے بلکہ وہ مسائل سے گھرے سماج کو حوصلہ بخشنے کے علاوہ ان سے نکلنے کی تدابیر کرے۔

اردو شاعری کی تاریخ گواہ ہے کہ اردو شاعری نے اپنے تمام سماجی ذمہ داریاں نہایت خوبی سے نبھائی ہیں۔ آج سے صدیوں پہلے جب دنیا فطرت کے بتائے ہوئے اصولوں پر قائم تھی تب تک سماج میں مسائل کا نام ونشان نہیں تھا۔ جیسے جیسے دنیا فطرت سے انحراف اور قدرت کے قانون سے کھیلتی گئی۔ ویسے ہی جستہ جستہ مسائل پیدا ہونے لگے۔ جدید دور میں قانون فطرت سے بغاوت کے نتیجے میں دنیا مسائل کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے اور دن بدن نئے نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ آزادی سے پہلے ہمارے ملک میں جہالت، غریبی، توہم پرستی، سماج، اونچ نیچ اور ذات پات کے مسائل تو تھے لیکن آزادی کے بعد ملک میں فرقہ واریت، مذہبی انتہاپسندی کے فسادات، ہتھیار کی ڈور حق تلفی، ظلم وناانصافی، تہذیبی یلغار اور دہشتگردی اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ سماجی غفلت، بے حسی، خود غرضی اور رشوت ہر طرف پھیل رہی ہے۔ شاعری سماجی مسائل کو اجاگر کرنے میں معاون ثابت ہو سکتی ہے اور نہیں بھی ہو سکتی ہے۔ یہ سب کچھ اس سماج میں رہنے والے شاعر کی اخلاقیات پر منحصر ہے۔ سماج میں بسے ہوئے شعراء اگر بے حس ومنافق ہوں اور سماج مسائل کے حل کو صرف حکمرانوں کی ذمہ داری سمجھتے ہوں تو ان کی شاعری سماجی مسائل کا احاطہ کبھی نہیں کرے گی اگر شاعرہ کا ضمیر زندہ ہو اور اس کی طبیعت سماجی مسائل پر مضطرب وبے چین رہتی ہے تو اس بات کے امکانات رہتے کہ شاعر سماجی مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع ضرور بنائے گا اگر فیض احمد فیض اور حبیب جالب کی شاعری کو دیکھا جائے تو ان کی شاعری میں سماجی مسائل کے موضوعات نظر آتے ہیں۔ سماج میں ہونے والی تبدیلیوں کے اثرات ہمیں شاعری میں نظر آتے ہیں۔ شاعری سماجی مسائل کو اجاگر کرنے کا اہم اور موثر ذریعہ ہے۔

حمیدہ شاہین کی نظموں کے موضوعات کو اگر دیکھا جائے تو ان کی نظموں میں ہمیں سماجی مسائل کے موضوعات نظر آتے ہیں۔

پانی سے بڑی آگ

اک جنگل جلتا ہے مجھ میں

جس کے ہر پیڑ کو فطرت نے

اپنے ہاتھوں سے سینچا تھا

ہر پیڑ کی شاخوں پر خوابوں کے غنچے تھے

ہر غنچے میں تھا رنگ مہکتی یادوں کا

ہر یاد سنہری کرنوں کے ہالے میں تھی

اس ہالے میں پورا جنگل آسودہ تھا

سرسبز، سکوں آور خوشبو سے بھرا ہوا

سکھ کی آغوش میں ہنستے جنگل پر جانے

کس جانب سے اک جلتی بلتی رت آئی

ہر پیڑ پہ شعلے کھل اٹھے

ہر شاخ پہ غنچے جھلس گئے

پنچھی کرلاتے پھرتے ہیں

یہ آگ بجھے گی اب کیسے (۲۵)

شاعرہ نے نظم میں "پانی سے بڑی آگ" سماجی ماحول کے سکون اور امن کے بارے میں بیان کیا ہے کہ پہلے ہر طرف بے خوفی چھائی رہتی تھی لیکن اب سماج میں ہر طرف بے حسی اور بے چینی کی لہر دوڑ گئی ہے

۔ جس کی وجہ سے سماج تباہ اور برباد ہو گیا ہے۔ سماجی استحصال کی وجہ سے سماج میں عجیب سا انتشار نظر آتا ہے۔ شاعرہ اس نظم کے آخری مصرعے میں یوں مخاطب ہیں کہ "یہ آگ بجھے گی اب کیسے "یعنی کب حالات پہلے کی طرح رواں دواں ہوں گے۔ ہر طرف بے چینی اور انتشار کی لہر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ پر امن ماحول میں کب بدلے گی؟

خواہشوں کے گھنے جنگلوں سے توکل کے جگنو

کہاں دربدر ہو گے

آرزو نے قناعت سے انگلی چھڑا کر کدھر رخ کیا

شکر کو قتل کر کے ہوس نے کہاں دفن کروادیا

بھوک کا دائرہ

ہوتے ہوئے کب اتنا کھلا ہو گیا

اڑتے پنچھی بھی جس میں سمانے لگے (۲۶)

نظم "ہندسوں کا پنجرہ" میں شاعرہ نے حد سے بڑھی ہوئی انسانی خواہشات جیسے ہوس، لالچ اور اس کے نتیجے میں ہونے والے مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ سماج میں بسنے والے افراد کی خواہشات اپنی حدود و قیود سے بالاتر ہو گئی ہیں۔ ہر انسان ایک سے دو کرنے کے چکر میں الجھا ہوا ہے جس کی وجہ سے انسان اتنا اندھا ہو گیا ہے کہ وہ شکر، صبر، قناعت جیسی اقدار کو پس پشت ڈال چکا ہے۔ قدیم زمانہ میں وسائل کی کمی تھی لیکن اس دور کے لوگوں کے دل اچھے تھے وہ دلوں کے سچے تھے لیکن آج کے دور میں انسان کے پاس بہت سے وسائل ہیں لیکن انسان ڈبل کرنے کے چکر میں جائز اور ناجائز راستہ اختیار کرنے لگ گیا ہے۔ ان مٹتی ہوئی اقدار کے نتیجے میں ہوس اور لالچ نے سماج کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے۔ انسان اپنی انہی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے قواعد و ضوابط کو بالائے طاق رکھ کر ان کے حصول کے لیے کوشاں ہو گیا ہے ۔ سماج میں ہر طرف مایوسی اور ناامیدی کا عنصر نظر آتا ہے۔

یہ سوئے ہوئے نیم مردہ تخیل

جنھیں ایک کروٹ کی ہمت نہیں ہے

نئے خواب کی کیا حفاظت کریں گے

یہ موسم نیا ہے

اسے اس گلستان کا راستہ دکھادے

جہاں کیاریاں منتظر ہیں کہ ان میں

نئے بیج بوئے گا کوئی کبھی تو

نئی کونپلیں سر اٹھانے لگیں گی

تو بدلے گا سارے گلستان کا منظر

ازل ہی سے مٹی کا پیغام ہے یہ

ڈھلے کوئی صورت، بنے کوئی پیکر

پرندہ ہو سپنا ہو، یا سبز موسم (۲۷)

شاعرہ نے نظم "مٹی کا اجتہاد" میں سماجی شعور کی آگاہی کو موضوع بنایا ہے۔ شاعرہ نے اس میں نئی نسل کو شعور کی آگاہی نہ ہونے پر تنقید کی ہے کہ نوجواں نسل غفلت کی نیند سوئی ہوئی ہے کہ یہ نیند کہیں انہیں نگل نہ جائے کیونکہ سماج میں بسنے والا ہر انسان اپنی ذاتی زندگی کی گردشوں میں اس طرح کھویا ہوا ہے کہ اسے سماجی شعور سے کوئی غرض نہیں۔

جنہیں اپنا اور اپنی قوم کا کل سنوارنا ہے ان میں آگاہی نہیں ہے نہ کسی منزل کا تعین۔ جو قوم پوری طرح سوئی ہوئی ہے وہ جنہیں آنے والوں کے لیے راستہ بنانا ہے۔ ان کی منزلوں کا تعین کرنا ہے نئے خواب نئی امنگوں کو لے کر چلنا ہے اگر وہ لوگ بیدار نہیں ہوں گے تو اپنا کل کیا سنواریں گے۔

اک نوچے ہوئے پیرہن کو بدن پر لپیٹے ہوئے

اپنے دامن میں اپنے ہی ٹکڑوں کو چن کر سمیٹے ہوئے

وہ عدالت کی دہلیز تک آگئی

اپنے مجرم کو منصف کی مسند پر دیکھا تو پتھر اگئی(۲۸)

شاعرہ اس نظم "عدالت" میں جدید دور کے سماجی مسائل پر سخت تنقید کرتی ہیں کہ سماج میں کس طرح مجرموں کو پناہ دی جاتی ہے ۔لوگ کس حد تک سنگ دل اور بے حس ہو گئے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ وہی مجرم جو جرم کا ارتکاب کرتا ہے بعد میں وہی انصاف کی مسند پر بیٹھا نظر آتا ہے۔اس نظم میں شاعرہ نے سماجی مسائل کے سب سے اہم مسئلے سماج کی ستم ظریفی اور بے انصافی کو موضوع بنایا ہے کہ سماج میں جو لوگ انصاف کرنے والے ہیں وہی اصل میں مجرم ہیں لیکن انہیں کوئی بھی سزا دینے والا نظر نہیں آتا۔ ظلم نہ جانے کب سے جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔

انسانی رویے:۔

شاعری میں انسان کے طور طریقوں، اس کے اخلاق و عادات،اس کی انسانی کمزوریوں و قوتوں اور اس کے اچھے اور برے رویوں کے بارے میں بہت زیادہ موضوع نظر آتے ہیں۔ شاعری میں انسانی فطرت کے ان پہلوؤں پر بھی بات کی جاتی ہیں جو عام زندگی میں ہماری نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں۔

رویے انسانوں کی پہچان ہوتے ہیں یہ مثبت بھی ہو سکتے ہیں اور منفی بھی ۔ سماج کی خوشحالی اور زوال کے اسباب بھی رویوں میں پہناں ہوتے ہیں ۔ سماج میں مثبت رویوں سے مثبت تبدیلی نظر آتی ہے جبکہ منفی رویوں سے سماج کا شیرازہ بکھر جاتا ہے ۔ یہ رویے ہی ہوتے ہیں جو دلوں کو کبھی آباد و شاد رکھتے ہیں اور انہی رویوں کی تبدیلی سے دل ٹوٹ جاتے ہیں اور یہی رویے گھروں اور سماجوں میں غیر آباد کرتے ہیں۔ انسان کے سماجی رویوں میں آنے والے تغیرات اس کے ارد گرد کے ماحول سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ ماحول کو بھی متاثر کرتے ہیں ۔ سماج میں بڑھتی ہوئی لا قانونیت ،انصاف کا فقدان،استحصالی نظام، ظلم و ستم یہ ایسے عوامل ہیں جو

اس نفسا نفسی کو بڑھاوا دینے کے اہم اسباب ہیں۔ بے رحمی، حسد اور نفرت یہ سب رویے بھی ماحول میں متاثر کن حد تک اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہمارے رویوں کی تلخی سے ہمارے سماج میں بگاڑ پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ تلخ رویوں کی سب سے بڑی وجہ ہماری زندگی کی تلخ تجربات ہیں۔

حمیدہ شاہین کی نظموں میں مختلف انسانی رویوں کے موضوعات نظر آتے ہیں جن کو پڑھنے سے ہمیں انسانوں رویوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ انہوں نے سماج میں پسے ہوئے مختلف افراد اور مختلف ماحول میں رہنے والے افراد کے رویوں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔

بھوک کا دائرہ

ہوتے ہوتے کب اتنا کھلا ہو گا

اڑتے پنچھی جس میں سمانے لگے (۲۹)

اس نظم "ہندسوں کا پنجرہ" میں شاعرہ نے ہوس اور لالچ کے رویے کو موضوع سخن بنایا ہے کہ انسانی خواہشات اس قدر زور پکڑ چکی ہیں اور انسان خیر و شکر کی تمیز بھول چکے ہیں۔ ان کو اچھے اور بھلے کی تمیز نہیں رہی سماج میں خیر کے رویوں کے بجائے شر کے رویے کامیاب ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔ ہر انسان اپنی ہوس اور لالچ میں اتنا اندھا ہو گیا ہے کہ اس کو اچھے اور برے کی تمیز بھول گئی ہے۔ وہ اپنی ہوس اور لالچ کے لیے دوسروں کو نقصان پہنچانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ ہر طرف مایوسی چھائی ہوئی ہے۔

سرخ کیے بے داغ کبوتر

مار گرائیں

ممٹی پر آ بیٹھی چڑیاں

ڈانٹ بھگایا

ڈال پہ بیٹھا ہریل توتا

ہر جانب سناٹا کر کے

جائے نماز پہ آ بیٹھا ہے (۳۰)

اس مختصر نظم "نقاب" میں شاعرہ نے منافقت کے رویوں کے بارے میں بات کی ہے۔ وہ افراد جن کے ہاتھ با ظاہر پاک و صاف نظر آتے ہیں لیکن در حقیقت وہ کسی نہ کسی پر ظلم و ستم سے رنگے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ بظاہر تو مظلوموں کی مدد کرتے نظر آتے ہیں لیکن در حقیقت وہ ایسے ہاتھ کاٹ رہے ہوتے ہیں جو دوسروں کی مدد کے لیے اٹھتے ہیں۔ اس نظم میں منافقت کا پہلو بڑے واضح انداز میں دکھائی دے رہا ہے یعنی نہاں کچھ ہے عیاں کچھ اور۔ سماج میں منافقت کی بیماری ہر انسان کے اندر پھیلی ہوئی ہے۔

کہیں بین بج رہی ہے

ہر سمت کوڑیالے

زیریلے پھن اٹھائے

لمبی زبان نکالے

لہراتے پھر رہے ہیں

گلیوں میں، آنگنوں میں

راہوں میں، محفلوں میں

پھنکار گونجتی ہے

ہر سو ہیں سرخ آنکھیں

کالی سیاہ دہشت

بے نام سی نحوست

پیروں میں رینگتی ہے

فصلوں میں پھر رہی ہے

پھولوں پھلوں کے رس کو

زہر اب کر رہی ہے

یہ زہر آگیں خلقت

اندھے بلوں سے باہر

کیسے امڈ رہی ہے

کہیں بین بج رہی ہے؟ (۳۱)

نظم "کہیں بین بج رہی ہے" میں شاعرہ نے سماج میں رہنے والے افراد کے رویوں میں ہونے والی تبدیلیوں کے بارے میں بیان کیا ہے۔ لوگوں کے دلوں میں اس طرح زہر پھیل رہا ہے کہ وہ کسی سانپ کے پھن کی طرح سر اٹھائے ہوئے ہیں اور وہ منافقت کے اس حد تک عادی ہو گئے ہیں کہ پتہ نہیں چلتا، کہ وہ کب کس روپ میں دوسرے انسان کو ڈس لیں۔ ان کے چہرے نحوست اور دہشت سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان رویوں سے سماج میں پیدا ہونے والی اچھائیاں بھی برائیوں میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ ہر طرف برائیوں کا دور دورہ نظر آتا ہے۔ اسی طرح عورت کے ساتھ مردوں کا جو رویہ سامنے آتا ہے۔ مثلا

ہرنی!

شیر بہت بھوکا ہے

آج تو اپنی بھوک سرہانے رکھ کر سو جا

باہر مت جا

ہرنی! شیر بہت بھوکا ہے (۳۲)

نظم "مشورہ" میں ہمارے سماج میں مرد کا عورت کے ساتھ جو رویہ ہے اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ شاعرہ نے ہرنی کو عورت اور مرد کو شیر سے تشبیہ دی ہے۔ اس نظم میں جنسی رویہ سامنے آتا ہے۔

انسان ہوس کا اس قدر شکار ہو چکا ہے کہ وہ ساری اقدار بھول چکا ہے۔ جب وہ جنسی بھوک کا شکار ہوتے ہیں تو ساری قدروں کو نقصان پہنچانے سے گریز نہیں کرتے۔

تم سے جتنا کام لے سکتے تھے وہ ہم لے چکے
ایسی چیزیں سینت کر رکھنے کا اب فیشن نہیں

آنے والے وقت میں جن کا کوئی مصرف نہ ہو

تم نے میری نسل کو آگے چلایا۔۔۔ شکریہ!

میری راتوں کو بہت رنگیں بنایا۔۔۔ شکریہ! (۳۳)

نظم "ڈسپوزایبل" میں شاعرہ عورت کے بارے میں مرد کے رویوں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ مرد کا عورت کی ساری زندگی کی مشقت کے حوالے سے کیا رویہ سامنے آتا ہے؟ کس حد تک وہ عورت کے بارے میں فکر مند رہتا ہے؟ عورت ساری زندگی مشقت کی چکی میں پستی رہتی ہے پھر بھی مرد کے رویے میں عورت کے لیے ہمدردی کا کوئی عنصر نظر نہیں آتا۔

مشرقیت:۔

مشرقیت اسرار کے پردے میں لپٹی ہوئی ہے۔ مشرقیت کو جاننے کے لیے مشرقیت کے اندر اترنا ضروری ہے یعنی جب تک کوئی شخص مشرقی سماج کے اندر رہ کر یہاں کے تہذیب و تمدن، رہن سہن اور سماجی اقدار کا خود مشاہدہ نہیں کر لیتا تب تک وہ مشرقیت نہیں جان سکتا۔ مشرقیت کے کئی رنگ ہیں جن میں شرم و حیا، اعلیٰ سماجی اقدار، انسانیت اور نسوانیت شامل ہے۔ حمیدہ شاہین کو نظموں میں مشرقیت کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔ ہم حمیدہ شاہین کو ایک مضبوط مشرقی نسائی آواز کہہ سکتے ہیں۔

یہ آنکھیں مہربان تھی

ہم نفس، ہم درد، اپنی تھیں

مگر اب ان سے کوئی اجنبی سی آنچ آتی ہے

مجھے یہ تو نہیں معلوم، کیسے آگ بھڑکی ہے

جلا کیا ہے؟

بچا کیا ہے؟

مگر اتنا تو بتلا دو

تمھارے راکھ داں میں ادھ پیے سگریٹ ہیں یا میں ہوں؟ (۳۴)

شاعرہ نے نظم "تمھارے لب پہ تھی میں بھی" میں مشرق میں عورت کے ساتھ ہونے والے برتاؤ کے حوالے سے بات کی ہے۔ عورت کی اپنے شوہر کی زندگی میں کیا اہمیت ہے اور وہ اس سے کیا امیدیں وابستہ کرتی ہے؟ کس طرح عورت کے نازک احساسات و جذبات کا خیال نہیں رکھا جاتا؟

اک سی پرواز

ایک سے انداز

ایک جیسا حسن

ایک جیسا ناز

حسن اور ناز کی

رنگ اور پرواز کی

ایک جتنی عمر

لڑکیاں ہیں تتلیاں (۳۵)

اس نظم "لڑکیاں اور تتلیاں" میں شاعرہ نے لڑکیوں کو تتلیوں سے تشبیہ دی ہے تتلیوں کی ناز کی اور ان کے حسن کو لڑکیوں کی ناز کی مزاجی اور خوبصورتی سے تشبیہ دی ہے جس طرح تتلی کا رنگ اور خوبصورتی انسان کو بے اختیار متوجہ کرتی ہے اسی طرح لڑکیوں کی شوخی اور الھڑپن انسان کا دل موہ لیتا ہے۔

اخلاقی اقدار:۔

شاعری ہر عہد میں تخلیق ہوتی آئی ہے لیکن حمیدہ شاہین کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے اخلاقی قدروں کی پامالی، لوگوں کی بے حسی اور لوگوں کے کھوکھلے پن کو اپنا موضوع بنایا ہے۔

کسی بھی سماج میں بسنے والے افراد کا اخلاقی اور سماجی رویہ اس قوم کی پہچان ہوتا ہے۔ روزمرہ زندگی میں رونما ہونے والے واقعات میں ہمارا مثبت یا منفی رویہ، محبت و نفرت کے جذبات، خلوص و ریاکاری اور غصے پر مبنی رویے ہماری قومیت کی پہچان ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تعلیم و تربیت، سماجی پس منظر، خاندانی وراثتی جینز کی خصوصیات ہمارے رویوں کی تشکیل کرتے ہیں تو لازمی بات ہے کہ اس کا اظہار ہمارے رویوں میں بھی نظر آئے گا۔ اگر ہمارے اردگرد موجود عام لوگوں کے رویوں اور سوچ کا مشاہدہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ ہم نہ صرف مالی طور پر بلکہ سماجی سطح پر بھی زوال پذیر ہیں۔ ہمارے رویوں میں ایک دوسرے سے بغض اور نفرت کے جذبات نظر آتے ہیں۔ اخلاقی اقدار اس حد تک گر چکی ہے کہ شاید اگر کہیں خلوص کی جھلک نظر آجائے تو انسان کے دل کو گمان ہونے لگتا ہے۔ اخلاقی اقدار نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے سماج میں اجتماعی طور پر اپنے ہم نفسوں کے لیے محبت نظر نہیں آتی جو کبھی ہمارے آباؤاجداد کا خاصہ تھی۔ آج کا دور نفسا نفسی کا دور ہے۔ تہذیب کی بد اخلاقیاں، مستیاں اور انسانیت سوز تباہیاں مسلسل پھیلتی جارہی ہیں۔ تہذیبوں کے اتار چڑھاو سے تہذیبوں کے اخلاقی رویوں میں تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے۔

یہ سب کچھ جانتے تھے ہم

مگر اک راز

جو، اس رہ کا نازک موڑ تھا

ہم نے نظر انداز کر ڈالا

کہ اپنے خون کو اپنی ہی شریانوں میں رستہ دیں

تو سڑکوں پر نہیں بہتا

جسے گھر میں ہی کوئی ہم نفس، ہم راز مل جائے

وہ غیروں سے نہیں کہتا

جو اپنے دل کے ٹکڑے اپنی ہی جھولی میں رکھتے ہیں

وہ مالا مال رہتے ہیں

جو اپنے ہر کھرے سکے کی پوری قدر کرتے ہیں

سدا خوشحال رہتے ہیں

یہ ایسا موڑ تھا

جس کو نظر انداز کر کے ہم نے اپنی راہ کھوٹی کی

یہ غفلت ایک کھائی بن کہ اب رستے میں آئی ہے

یہاں اک پل بنانا ہے

اسے اک دوسرے کا ہاتھ پکڑے پار کرنا ہے[۳۶]

شاعرہ نے نظم "یہاں اک پل بنانا ہے" میں اخلاقی اقدار کی تعمیر کا پیغام دیا ہے کہ اب متحد ہونے کا وقت ہے۔ وہ لوگ جو اپنی اخلاقی اقدار اور روایات کی پاسداری کرتے ہیں۔ انھیں دوسروں کے سامنے جھولی پھیلانے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ روایات اور اقدار سے جو قومیں جڑیں رہتی ہیں وہ اتنی ہی کامیاب اور کامران رہتی ہیں اور وہ جو اقوام اپنی اخلاقی قدروں کو بھول جاتی ہیں۔ ان کی جڑیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔

۲۔ فنی و اسلوبی جائزہ:۔

حمیدہ شاہین کی نظموں کے مجموعے کا فکری و موضوعاتی جائزہ لینے کے بعد فنی نقطہ نگاہ سے بھی ان کی نظموں کا جائزہ لیا جائے گا۔ انہوں نے اپنی نظموں میں منفرد اسلوب و تراکیب استعمال کر کے اپنی نظم کو ایک الگ پہچان دی۔ ذیل میں ان کی نظموں کا فنی و اسلوبی جائزہ لیا گیا ہے۔

زبان وبیان:

شاعری میں زبان وبیان کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے جہاں تک حمیدہ شاہین کی نظموں کے اسلوب کی بات ہے تو انہوں نے اپنی نظموں میں الفاظ کا چناؤ بڑے بہترین انداز میں کیا ہے۔ ان کی نظموں میں فارسی، اردو، ہندی، عربی اور سنسکرت زبانوں کا امتزاج ملتا ہے۔ ان کی نظموں میں عربی وہندی اور فارسی و سنسکرت کے الفاظ کا جابجا استعمال ملتا ہے۔

ڈاکٹر شمیم حنفی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

"ان نظموں کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ ان میں جذبے، خیال، بیان اور اسلوب میں کہیں بھی اکہرے پن کا احساس نہیں ہوتا یہ ایک گہری وجودی سطح رکھنے والی شاعری ہے اور اس میں جابہ جا تخلیقی امکانات کا ایک جال سا بچھا ہوا ہے۔"(۳۷)

مثلاً:

ہم اپنے دل کے دروازوں پہ استادہ ہیں صدیوں سے
کوئی آہٹ، کوئی جھونکا، ہماری روح میں اترے
ہمارا نام لے کوئی، ہمیں پہچان لے کوئی
ہمیں بھی مان لے کوئی(۳۸)

تشبیہات واستعارات:۔

تشبیہات واستعارات کے استعمال سے کسی بھی تحریر میں نکھار آجاتا ہے۔ شاعری میں بھی تشبیہات و استعارات کا استعمال اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ حمیدہ شاہین نے اپنی نظموں میں بر محل تشبیہات واستعارات کا استعمال کیا ہے۔ حمیدہ شاہین نے اپنی نظموں میں ایسے استعارات بھی استعمال کئے ہیں جو بالکل منفرد ہیں جن کا استعمال ان سے پہلے نہیں ہوا۔ مثال کے طور پر روٹی، ان ڈور پلانٹ اور ڈسپوز ایبل وغیرہ۔

شیر کی اپنی خدائی

ریچھ کے اپنے ضوابط

بھیڑیے کا اپنا ہی قانون

ان پر

حرف گیری کا کسی کو حق نہیں(۳۹)

"جنگل" استعارتی اور علامتی نظم ہے اس نظم میں شاعرہ نے شیر، ریچھ اور بھیڑیے جیسے استعارات استعمال کر کے حکومت پر گہرا طنز کیا ہے۔ حکمران، سرمایہ دار اور بیوروکریٹس نے اپنا ہی قانون بنایا ہوا ہے جس کی وجہ سے عام افراد کو ان پر حرف گیری کا حق حاصل نہیں ہے۔

حسن اور ناز کی

رنگ اور پرواز کی

ایک جتنی عمر

لڑکیاں ہیں تتلیاں(۴۰)

شاعرہ نے نظم "لڑکیاں اور تتلیاں" میں لڑکیوں کی نازکی اور حسن کو تتلیوں کی نازکی سے تشبیہ دی ہے۔ جس طرح تتلی کے رنگ جلدی اڑ جاتے ہیں اسی طرح ہمارے معاشرے کی ناانصافیوں، بے حسی اور جنسی تضاد کی وجہ سے لڑکیوں کا الھڑ پن اور نازکی وقت سے پہلے رخصت ہو جاتی ہے۔

میں ٹھنڈے توے کی روٹی ہوں

مجھے بے دھیانی میں ڈالا گیا

مجھے بے دردی سے پلٹا گیا

مرے کتنے ٹکڑے اکھڑ گئے(۴۱)

شاعرہ نے نظم "اک بے دھیانی" میں "روٹی" کا منفرد استعارہ استعمال کیا ہے۔ اس سے پہلے اس طرح کے استعارے کا استعمال نہیں ملتا۔ شاعرہ نے ٹھنڈے توے کی روٹی سے لے کر چنگیر تک، اس استعاراتی سفر کے ذریعے عورت کی زندگی کو بڑی چابکدستی سے بیان کیا ہے کہ عورت ساری زندگی سفر میں رہتی ہے۔ اس نظم میں سماج میں عورت کا مقام، اس کی پہچان اور اس دوران ہونے والی جدوجہد کو بیان کیا گیا ہے۔ عورت کے حوالے سے یہ بے دھیانی اجتماعی بھی ہے اور انفرادی بھی۔ کیونکہ بے دھیانی ایک جیتے جاگتے وجود کو مار دیتی ہے۔

تلمیحات (صنعت تلمیح):۔

تلمیح کے لغوی معنی اشاہ کرنا جبکہ اصطلاحی معنی ہیں کہ ایک لفظ یا مجموعہ الفاظ کے ذریعے کسی تاریخی، اخلاقی یا مذہبی واقعے کی طرف اشارہ کیا جائے۔ تلمیح کے استعمال سے اشعار میں وسعت اور معنویت پیدا ہوتی ہے۔ ایسے اشعار جن میں صنعت تلمیح کا استعمال کیا گیا ہو۔ ان کے مطالعے سے قاری کے ذہن میں وہ واقعہ دوبارہ تازہ ہو جاتا ہے جس کا ذکر تلمیح کے ذریعے کیا گیا ہو۔ حمیدہ شاہین کی نظموں میں تلمیحات کا استعمال ان کی نظموں کے حسن میں اضافہ کرتا ہے۔ مثال کے طور پر

مجھے مسلک چشم یعقوب پر کیسے لایا گیا ہے

کسے کیا بتاؤں!

مرا دل تو بیعت پہ راضی نہیں تھا

میں جبراً ہی گریہ کے اس سلسلے میں پرو دی گئی ہوں

ابھی تک گلے میں گرہ سی بندھی ہے

جو کھلتی نہیں ہے

کھلے تو میں نوحہ کروں، کھل کے روؤں (۴۲)

نظم "پیالے سے چھلکی ہوئی نظم" کی پہلی لائن میں "مسلک چشم یعقوب" کی تلمیح استعمال کی ہے۔اس تلمیح کے ذریعے شاعرہ نے گریہ و زاری، ہجر اور درد کا اظہار کیا ہے۔اس کے علاوہ چند اور مثالیں مندرجہ ذیل ہیں

وہ زندہ روح تھا یہ دل

باذن اللہ جو مردوں میں اتری زندگی بن کر (۴۳)

نظم "کہاں سے پھیلتی ہے چپ" میں حضرت عیسی علیہ السلام کے واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جس طرح حضرت عیسی علیہ السلام اللہ تعالی کے حکم سے مردے میں دوبارہ روح پھونک دیتے تھے، ویسے ہی شاعرہ کہتی ہیں کہ ہماری روح اور دل تب ہی پاکیزہ ہو سکتے ہیں۔جب اللہ تعالی کا اذن ہو گا، جب اللہ تعالی کی طرف سے اس میں پاکیزگی پیدا ہو گی، وہی پاکیزگی اس میں دوبارہ زندگی بن کر اترے گی۔

یہ ان لمحوں کا محرم تھا

رہیں گے تا ابد روشن جو اقرأ کی شعاعوں سے (۴۴)

شاعرہ نے نظم "کہاں سے پھیلتی ہے چپ" کے اس شعر میں سورۃ علق کے نازل ہونے والے واقعے کا ذکر کیا گیا ہے۔وہ اقراء خالی اقراء نہیں تھا بلکہ وہ ایک ایسی تعلیم تھی جو اللہ تعالی کے حکم پر عمل کرنے کی راہنمائی تھی۔وہ تعلیم جو اللہ تعالی کے علم سے خارج ہو وہ علم نہیں ہے اور نہ اس میں شعور ہے۔شاعرہ کہتی ہیں آج ہم اتنے بے شعور اور بے علم ہو چکے ہیں اور جو ہمارا تعلیمی نظام ہے اس میں اللہ تعالی کے حوالے سے ہمیں علم اور شعور نہیں ملتا ہے۔وہ اسی صورت میں مکمل ہوتی ہے جب ہم اللہ تعالی کے احکامات پر عمل کریں۔

صنائع بدائع:۔

اردو شاعری میں وہ علم جس میں کلام یا تحریر کی خوبیوں اور زیب و آرائش پر بحث کی جاتی ہے، وہ علم، علمِ بدیع کہلاتا ہے۔اس مقصد کے لیے اصول و طریقے صنعتوں کی صورت میں مروج ہیں جو شاعری میں

حسنِ کلام کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ ان کو استعمال کرنے یا نہ کرنے سے متن کی صحت متاثر نہیں ہوتی بلکہ ان کے استعمال سے کلام کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے جبکہ علم بیان میں قواعد وضوابط کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے یعنی علمِ بدیع الفاظ کے چناؤ اور استعمال کا تعین کرتا ہے۔

حمیدہ شاہین نے اپنی نظموں میں مختلف صنائع بدائع استعمال کئے ہیں جن میں صنعت تکرار، صنعت ابہام، صنعت تضاد اور صنعت مراعاۃ النظیر قابلِ ذکر ہیں۔

الف۔ صنعت تکرار:۔

صنعت تکرار کے استعمال سے کلام میں حسن پیدا کیا جاتا ہے۔ کلام میں کسی ایک لفظ کو بار بار استعمال کیا جائے یا شاعری کے مصرعے میں دوہرایا جائے تو وہ صنعت تکرار کہلاتا ہے۔ حمیدہ شاہین نے اپنی نظموں میں صنعت تکرار کے جابجا استعمال سے ان میں چاشنی اور ترنم پیدا کیا ہے۔

میری گردن میں موٹی زنجیر ہے
مجھے منہ کے بل گھسیٹا جاتا ہے
گلی گلی
شہر شہر
رشتہ رشتہ
شکوک وشبہات کی ریت میں
طعنوں کے پتھروں
اور تہمت کے کانٹوں پر
میری ناک ٹوٹ چکی ہے (۴۵)

شاعرہ نے نظم "میں ایک بار سر اٹھانا چاہتی ہوں" میں صنعت تکرار سے حسن و تاثیر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ گلی گلی، شہر شہر اور رشتہ رشتہ کی تکرار عورت کے سفر کی اذیت، تشدد اور انتہائی کرب کی کیفیت کو ظاہر کرتی ہے۔

ب۔ صنعت ایہام:۔

شاعر اپنی شاعری میں ایسے الفاظ کا ستعمال کرے جو دو معنی رکھتا ہو، ایک معنی بعید اور ایک معنی قریب، وہ صنعت ایہام کہلاتی ہے۔ اس صنعت میں ایسے الفاظ کو استعمال کیا جاتا ہے جو دو یا دو سے زیادہ معانی رکھتے ہوں۔ حمیدہ شاہین نے اپنی نظموں میں صنعت ابہام کو بھی استعمال کیا ہے۔

سنا ہے روشنی بھی لازمی عنصر ہے جینے کا

اندھیرے کا تسلسل زندگی کو چاٹ جاتا ہے

مجھے بھی زندہ رہنے کو ضیا درکار ہے سائیں

ہوا درکار ہے سائیں(۴۶)

اس نظم "ان ڈور پلانٹ" میں لفظ ضیا اور سائیں حقیقی اور مجازی دونوں معنوں استعمال ہوئے ہیں۔ ضیا کا مطلب روشنی ہے جبکہ شاعرہ کے شوہر کا نام بھی ضیا ہے۔ سائیں لفظ کو مختلف زبانوں میں مالک کے معانی میں برتا جاتا ہے۔ یہ خدا کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے جبکہ سندھی اور پنجابی میں سائیں کا لفظ شوہر کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

ج۔ صنعت تضاد:۔

کلام میں ایسے الفاظ کو استعمال میں لانا جو ایک دوسرے کے مقابل ہوں، شعر کی اصطلاح میں ایسے الفاظ کو استعمال کرنا جن میں مخالفت پائی جائے، مثال کے طور پر سفید اور سیاہ، اندھیرا اور اجالا وغیرہ۔ شاعرہ کی نظموں میں صنعت تضاد کی مثالیں نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر:

کبھی تم محبت کا ہفت رنگ آسمان بن کر

میری زمین پر تن جاتے ہو

کبھی تم سلگتا سورج بن کر

دھوپ کے تیر برساتے ہو(۴۷)

ایک چرمر کیلنڈر ہے

جس میں کوئی رات معراج تھی

کوئی دن عید کا(۴۸)

د۔ صنعت مراعاۃ النظیر:۔

شاعری میں ایسے الفاظ کو استعمال میں لانا جن کے معانی آپس میں متضاد ہونے کے باوجود کسی حد تک مشابہت رکھتے ہوں۔ جیسے گل خار اور پھول بوٹے وغیرہ کا ذکر کرنا۔ حمیدہ شاہین کی نظموں میں صنعت مراعاۃ النظیر کی مختلف مثالیں ملتی ہیں۔

اک جنگل جلتا ہے مجھ میں

جس کے ہر پیڑ کو فطرت نے

اپنے ہاتھوں سے سینچا ہے

ہر پیڑ کی شاخوں پر خوابوں کے غنچے تھے

ہر غنچے میں تھا مہکتی یادوں کا

ہر یاد سنہری کرنوں کے ہالے میں تھی

اس ہالے میں پورا جنگل آسودہ تھا

سرسبز، سکوں آور، خوشبو بھرا ہوا

سکھ کی آغوش میں ہنستے جنگل پر جانے(۴۹)

یہ پر سکون وادیاں

ہرے شجر، سفید پھول، کھکھلاتی تتلیاں

یہ جھاگ اڑاتے پانیوں میں چمچماتی مچھلیاں

قطار میں بنے مکاں

دھواں اگلتی چمنیاں

پھلوں کی دل ربا مہک فضاؤں میں رچی ہوئی

یہاں وہاں کھڑی ہیں بھیڑیں اون سے لدی ہوئی(۵۰)

حوالہ جات

۱۔ آفتاب اقبال شمیم، معنی کی بازیافت کا خواب، مشمولہ زندہ ہوں، ملٹی میڈیا افیرز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۲۲

۲۔ ستیہ پال آنند، ڈاکٹر، زندہ ہوں (حرف چند)، ص ۱۶

۳۔ سرور امان، ماہنامہ، آئینہ، لاہور، شمارہ ۷، جون، ۲۰۱۱ء

۴۔ شمیم حنفی، ڈاکٹر، تخلیقی امکانات کا جال، مشمولہ، زندہ ہوں، ملٹی میڈیا افیرز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۲۱

۵۔ انجم رومانی، دستک، کتاب نما، جنوری ۱۹۹۵ء، فلیپ

۶۔ غلام حسین ساجد، روئے اسی وی آں، مشمولہ، بنیاد، لاہور، جلد دوم، شمارہ ۱، لمز، ۲۰۱۱ء

۷۔ حماد نیازی، مضمون زندہ ہوں، آن لائن، ۷ دسمبر ۲۰۱۷ء، وقت 8:05pm

۸۔ حمیدہ شاہین، زندہ ہوں، ملٹی میڈیا افیرز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۰۱

۹۔ ایضا

۱۰۔ علی عباس جلالپوری، رسوم اقوام،، تخلیقات، لاہور، ۱۰ اگست ۲۰۰۰ء، ص ۱۳۵

۱۱۔ حمیدہ شاہین، زندہ ہوں، ملٹی میڈیا افیرز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۰۱

۱۲۔ شاہد بخاری، ماہنامہ، ادب لطیف، لاہور، شمارہ نمبر ۵، مئی ۲۰۰۶ء، ص ۱۳۶

۱۳۔ حمیدہ شاہین، زندہ ہوں، زندہ ہوں، ملٹی میڈیا افیرز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۳۷

۱۴۔ ایضاً، ص ۹۴، ۹۳

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۳۳

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۳۲

۱۷۔ ایضاً، ص۱۶۱

۱۸۔ ایضاً، ص۱۷۳

۱۹۔ ایضاً، ص۱۷۱

۲۰۔ آفتاب اقبال شمیم، معنی کی بازیافت کا خواب، مشمولہ زندہ ہوں، ملٹی میڈیا افیرز، ۲۰۱۰ء، ص۲۲

۲۱۔ حمیدہ شاہین، زندہ ہوں، ملٹی میڈیا افیرز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص۶۴

۲۲۔ ایضاً، ص۱۰۱

۲۳۔ ایضاً، ص۱۶۶

۲۴۔ ایضاً، ص۱۵۶

۲۵۔ ایضاً، ص۱۳۷

۲۶۔ ایضاً، ص۵۲

۲۷۔ ایضاً، ص۹۱، ۹۲

۲۸۔ حمیدہ شاہین، دستک، کتاب نما، لاہور، جنوری ۱۹۹۵، ص۶۲

۲۹۔ حمیدہ شاہین، زندہ ہوں، ملٹی میڈیا افیرز، لاہور، ۲۰۱۰ء ص۵۲

۳۰۔ ایضاً، ص۸۰

۳۱۔ ایضاً، ص۱۰۳

۳۲۔ ایضاً، ص۱۲۱

۳۳۔ ایضاً، ص۱۶۴

۳۴۔ ایضاً، ص۳۴

۳۵۔ ایضاً، ص۱۴۸

۳۶۔ ایضاً، ص۷۰

۳۷۔ شمیم حنفی، ڈاکٹر، تخلیقی امکانات کا جال، مشمولہ زندہ ہوں، ملٹی میڈیا افیرز، لاہور، ۲۰۱۰، ص۲۱

۳۸۔ حمیدہ شاہین، زندہ ہوں، ملٹی میڈیا افیرز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص۱۴۸

۳۹۔ ایضاً، ص۱۱۴

۴۰۔ ایضاً، ص۱۴۸

۴۱۔ ایضاً، ص۱۳۳

۴۲۔ ایضاً، ص۳۷

۴۳۔ ایضاً، ص۷۶

۴۴۔ ایضاً، ص۷۶

۴۵۔ ایضاً، ص۱۷۵

۴۶۔ ایضاً، ص۱۵۶

۴۷۔ ایضاً، ص۱۷۱

۴۸۔ ایضاً، ص۹۵

۴۹۔ ایضاً، ص۱۳۷

۵۰۔ ایضاً، ص۱۱۱

باب چہارم:

منتخب اہم شاعرات اور حمیدہ شاہین کے سماجی شعور کا جائزہ

شاعری ادب کی اہم اصناف میں سے ایک صنف ہے شاعری کا ماخذ "شعر" ہے اس کے معنی کسی چیز کے بارے میں سوجھ بوجھ رکھنا یا کسی چیز کے بارے میں جاننے اور واقفیت کے ہیں شعر کے لغوی معنٰی فیروز اللغات میں یوں درج ہیں۔

i. جاننا_ کسی باریک چیز کا جاننا

ii. موزوں و مقضی کلام

iii. سخنِ موزوں[1]

لیکن اصطلاحاً شعر وہ کلام موزوں ہے جو قصداً کہا جائے۔ کلام موزوں احساسات و جذبات کے تابع ہوتا ہے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ شاعر کوئی ایسا واقعہ یا حادثہ دیکھ لے جو اس کے دل پر اپنا چھوڑ جائے اور شاعر خود بخود الفاظ کی صورت میں اظہار کرنے لگے ، اس اثر کے بیان کو شعر کہا جاتا ہے، ان اشعار کو شاعری کے نام سے جانا جاتا ہے۔ موزوں الفاظ کے ذریعے حقائق کی تصویر کشی کو شاعری کہا جاتا ہے مجنوں گورکھ پوری لکھتے ہیں:

"شاعری موزوں اور پر ترنم الفاظ میں دلی جذبات کا اظہار ہے"۔[2]

شاعری کسی بھی انسان کے احساسات اور مشاہدات کی ترجمان ہوتی ہے کیونکہ چاہے کوئی بھی انسان ہو وہ اپنے ارد گرد کی اشیاء پر غور و فکر کرتا ہے، غور و فکر کرنے کے بعد وہ کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچتا ہے لیکن حساس لوگوں کے مشاہدات عام انسانوں کی کی نسبت زیادہ گہرے ہوتے ہیں۔ شاعری کا تعلق بھی حساس لوگوں کے ساتھ زیادہ ہوتا ہے لیکن مشاہدات و تجربات کے بارے میں اظہار کرنے کے لیے سب کا انداز بیان مختلف ہوتا ہے۔ کچھ لوگ اس کو لکھ کر نثر کی صورت میں بیان کرتے ہیں تو کچھ لوگ فن مصوری کی صورت میں اپنے احساسات کی عکاسی کرتے ہیں اور کچھ لوگوں کے احساسات کے اظہار کا ذریعہ شاعری ہوتی ہے۔ شاعری کے اپنے الگ اصول ہیں شاعری کا لفظ صرف اردو زبان کے لیے مخصوص ہے۔

ادب کی صنف شاعری کی بہت سی اقسام ہیں جن میں صنف غزل سب سے قدیم اصناف سخن میں ایک ہے اس کے علاوہ شاعری میں مشہور اصناف حمد، نعت، مثنوی، قصیدہ، رباعی، مسدس، پابند نظم، نظم

معری، آزاد نظم، سلام و گیت سر فہرست ہیں۔ تاریخ میں اگر اُردو شاعری کے اہم شعراء کو دیکھا جائے تو وہ بر صغیر ہندوستان میں ملتے ہیں جن میں میر تقی میر، مرزا غالب، داغ دہلوی، ولی دکنی اور بہادر شاہ ظفر کے نام سر فہرست ہیں جبکہ تقسیم ہندوستان کے بعد بہت سے مشہور شعراء کا تذکرہ ملتا ہے جن میں پاک و ہند کے شعراء شامل ہیں ان شعراء میں سے چند اہم شعراء کے نام یہ ہیں علامہ اقبال، فیض احمد فیض، حسرت موہانی، ابن انشاء، حبیب جالب، شکیب جلالی، ناصر کاظمی، محسن نقوی، احمد فراز اور منیر نیازی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

خواتین اس دنیا کی نصف آبادی ہونے کے باوجود ایک الگ صنف نہیں مانی جاتی تھی کہ یہ صنف نازک بھی ایک الگ سوچ و تخیل کی مالک بھی ہو سکتی ہے کیونکہ ہم جس سماج میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اس میں عورت کے وجود کو ایک الگ وجود ماننے سے ہمیشہ انکار ہی رہا ہے۔ یہ روایت صدیوں سے چلی آ رہی ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ سوچ میں تبدیلی آتی گئی اب کئی شعبوں میں خواتین مردوں کے شانہ بشانہ متحرک نظر آتی ہیں ۔وہ زندگی کے سب شعبوں میں نمایاں مقام بنا چکی ہیں زندگی کے انہی شعبوں میں سے ایک شعبہ شاعری بھی ہے شاعری جیسے نازک شعبے میں خواتین شاعرات اپنا آپ منواتی نظر آ رہی ہیں حالانکہ ماضی میں یہ صرف مردوں کا شعبہ مانا جاتا تھا کیونکہ پہلے کے دور میں کوئی بھی خاتون شاعرہ اس میں طبع آزمائی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اگر کوئی شاعرہ اس میں طبع آزمائی کرتی بھی تھی تو وہ عورت کے لہجے کی بجائے مردانہ لہجے میں شاعری کرتی تھی تاکہ کسی کو معلوم نہ ہو سکے یہ کلام کسی خاتون شاعرہ کا ہے یا کسی مرد شاعر کا۔ کیونکہ قدیم عہد میں اس شعبے میں خواتین شعراء کی طبع آزمائی کو معیوب سمجھا جاتا تھا ۔اکثر خواتین شاعرات کو تو اپنے گھر سے بھی اس شعبے میں آنے کی اجازات نہیں ملتی تھی۔

لیکن وقت کے ساتھ ساتھ حالات تبدیل ہوتے گئے اور خواتین چند مخصوص شعبوں تک محدود رہنے کی بجائے مختلف شعبوں میں اپنے کام کی ذمہ داریاں نبھانے لگ گئی۔ وہ پرانے دور کے صنفِ نازک کی طرح مظلوم عورت بن کر نہیں رہی۔ جو ہر وقت مردوں کے ظلم و ستم سہتی تھی اور حرف شکایت تک زباں پر نہیں لاتی تھی لیکن اب وہ اس قابل ہو چکی ہیں کہ اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے مردوں کے جبر پر آواز بلند کر سکے اور اسے اپنی ذات پر ظلم سے باز رکھ سکے۔

زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح شاعری میں بھی اب خواتین بھرپور طریقے سے نمائندگی کرتی ہیں "بہارستان ناز" کے نام سے حکیم فصیح الدین رنج کا ایک تذکرہ ملتا ہے جس میں انہوں نے شاعرات کے

حالات زندگی اور نمونہ کلام بیان کیے ہیں اس تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان شاعرات کو شاعری کرنے کے لیے کن کن حالات اور مراحل سے گزارنا پڑا۔ اس تذکرے کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام شاعرات کے ہاں مذکر صیغہ استعمال ہوا ہے۔ ان شاعرات کے ہاں اکثر موضوعات روایتی آتے ہیں کہیں بھی کوئی نسوانی رنگ اور احساس نظر نہیں آتا۔ ان شاعرات میں سے بعض شاعرات نواب گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

بعض محققین مہ لقا چندا کو پہلی صاحب دیوان شاعرہ تسلیم کرتے ہیں جبکہ کچھ محقق لطف النساء کو پہلی صاحب دیوان شاعرہ قرار دیتے ہیں اسی طرح واجد علی شاہ کا دور شاعری کے حوالے سے بہت بھرپور نظر آتا ہے۔ ان کی بیگم صدر محل بھی صاحب دیوان شاعرہ ہیں اور وہ مشکل زمینوں میں شعر گوئی کے حوالہ سے کافی مقبول تھیں۔ ان کے علاوہ فصیح الدین کے تذکرے میں ایسی شاعرات کا تذکرہ بھی ملتا ہے جو شاعری میں باقاعدہ تخلص استعمال کرتی تھیں۔ اس عہد میں زمانے کے اقدار میں تبدیلی آنے کے ساتھ ساتھ مرد اور عورت دونوں کی سوچ میں تبدیلی واقع ہوئی ہے اور عورتوں کی اہمیت کا اعتراف بھی کیا ہے کیونکہ عورت نے اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے معاشرے میں اپنا مقام خود بنایا ہے۔

اردو شاعری میں خواتین شعراء نے دونوں اصناف یعنی نظم اور غزل میں طبع آزمائی کی ہے اردو شاعری کی چند معروف شاعرات جن ادا جعفری، زہرا نگاہ، شبنم شکیل، پروین شاکر، کشور ناہید، وغیرہ شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کر رہی ہیں۔ عورت ایک مکمل فرد ہے۔ اسکی اپنی الگ دنیا ہے، اس کا اپنا تخیل ہے اس کی زندگی کو دیکھنے کے اپنے الگ نظریات ہیں اور وہ کس طرح فنی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے انھیں نبھاتی ہے کیونکہ عورت ہی محسوس کر سکتی ہے وہی عورت کی دنیا کے بارے میں، اس کے تخیل کے بارے میں جانتی ہے۔ اس کو سامنے رکھ کر وہ ادب تخلیق کرتی ہے اور زندگی کے تجربات و واقعات کو وہ نوکِ قلم پر لاتی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو خواتین شاعرات نے زندگی کے تمام معاملات پر طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کے ہاں ایک خاص رجحان جو اکثریت کے ہاں دیکھنے کو ملا ہے وہ نسائیت کا پہلو ہے۔

ا۔ ادا جعفری:۔

ادا جعفری ۲۲ اگست ۱۹۲۴ء میں بدایوں اتر پردیش بھارت میں پیدا ہوئی۔ پاکستانی اردو شاعرات میں ادا جعفری کو خاتونِ اول کہا جاتا ہے۔ یہ پہلی شاعرہ ہیں جنہوں نے روایت سے ہٹ کر موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور کھل کر مردوں کے خلاف اپنی آواز بلند کی کیونکہ ان سے پہلے مردوں کے جبر کے خلاف جو

آوازیں اٹھائی گئیں لیکن وہ آوازیں دبی دبی تھیں اور تعداد کے لحاظ سے کم تھیں لیکن ادا جعفری اردو شاعری میں پہلی مضبوط نسوانی آواز بن کر ابھری۔ ان کی شاعری کے مجموعوں میں "ساز ڈھونڈتی رہی"، "شہر درد"، غزلاں تم تو واقف ہو"، "ساز سخن بہانا ہے "اور "حرف شناسائی" منظر عام پر آچکے ہیں جبکہ "موسم موسم" کے نام سے ان کا کلیات شائع ہو چکا ہے۔ ادا جعفری نے دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل میں ادا جعفری کا ایک خاص طرز ہے۔ انہوں نے پہلی مرتبہ غزل میں تانیث کا صیغہ استعمال کیا ہے کیونکہ ادا جعفری سے پہلے کسی بھی شاعرہ نے اس طرح کی جرات کا اظہار نہیں کیا۔ ادا جعفری کے بارے میں حمایت علی شاعر لکھتے ہیں:

> "اردو ادب کی تین خواتین ایسی ہیں جو اپنی انفرادیت کے سبب افسانے شاعری اور تنقید میں اولیت کا اعزاز رکھتی ہیں۔ عصمت چغتائی، ادا جعفری اور ممتاز شیریں اس اعتبار سے ادا جعفری کو جدید اردو شاعری کی خاتون اول کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔[۳]

ادا جعفری کے کلام کی نمایاں خصوصیت رجائیت ہے۔ ان کے ہاں ذات اور وجود کی آگہی کا رویہ نمایاں ہے۔ ان کے موضوعات میں ممتا کا احساس، انسان دوستی اور انسانیت پر یقین کے علاوہ احترام اور انسانی سماج کی بقا کا درس وغیرہ شامل ہے۔ فیض احمد فیض نے لکھا ہے کہ:

> "ادا کے لہجے میں ایسا یقین اور ان کی آواز میں ایسی تمکنت ہے جو شاعر کو جہد اظہار میں اپنا ہاتھ آجانے کے بعد ہی نصیب ہوتی ہے چنانچہ ادا جعفری نے درد کا جو شہر تخلیق کیا ہے۔ اس شہر کی دیواریں ان کی ذات تک محدود نہیں قریب قریب عالمگیر ہیں اور اس دور میں حزن و یاس کا عنصر بہت کم ہے اور اس میں عزم و استقلال کا دخل کہیں زیادہ ۔ شہر درد نہایت موثر باسلیقہ اور باوقار کلام کا مجموعہ ہے۔"[۴]

ادا جعفری نے اپنی نظموں میں مختلف سماجی و معاشرتی مسائل کے درد کی تصویر پیش کی ہے۔ یہ سماجی المیے ہی سماج میں غیر مساویت کا سبب بنتے ہیں۔ یہ سماجی مسائل اور بیروزگاری ہی ننھے منے ہاتھوں کو خوانچے، ریڑھیاں اور رکشا پیں چلانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اس صورت حال کی عمدہ مثال ادا جعفری کی نظم "جلے بجھے دیوے" ہے ادا جعفری کی شاعری میں سیاسی و سماجی جبر کا پہلو بھی نظر آتا ہے لیکن اس جبر کے خلاف ان کے لہجے میں احتجاج باغیانہ نہیں ہے۔ ان کی شاعری عصری حقیقتوں اور سماجی تلخیوں کی نہایت خوبصورتی سے ترجمانی کرتی ہے۔ ان کے ہاں قدیم اور فرسودہ نظام کے خلاف بغاوت کا عنصر ملتا ہے۔ ان کے مجموعے میں

متعدد موضوعات نظر آتے ہیں جن میں وسعت کے ساتھ ساتھ حب الوطنی اور حسیت کے رویے بھی واضح طور پر موجود ہیں۔

تم اس دیار میں انسان کو ڈھونڈتی ہو جہاں
وفا ملے تو یہ احساس مجرمانہ ملے[۵]

یا رب مجھے بتا کہ مرے عہد کا مسیح
اپنی صلیب آپ کہاں تک اٹھائے گا[۶]

حمیدہ شاہین کے ہاں عورتوں کے حوالے سے دبی دبی آواز کی بجائے با اعتماد اور خود شناس آواز نظر آتی ہے۔ دونوں شاعرات کے ہاں ایک مشترک وصف یہ بھی ہے کہ انہوں نے غزل اور نظم دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے یہاں نسوانی، معاشرتی مسائل کے علاوہ عصری اور سماجی مسائل یکساں نظر آتے ہیں۔ اسی طرح ادا جعفری اور حمیدہ شاہین کے ہاں حب الوطنی کے موضوعات نمایاں ہیں۔

۲۔ پروین فنا سید (۱۹۳۴-۲۰۱۰):۔

پروین فنا سید ۵ مئی ۱۹۳۴ کو لاہور کے سید گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد کا نام سید ناصر حسین رضوی ہے۔ "حرف وفا" اور "تمنا کا دوسرا قدم" ان کے شعری مجموعے ہیں۔ ڈاکٹر رشید امجد پروین فنا سید کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

> "پروین فنا سید ایک واضح نظریاتی وابستگی کی شاعرہ ہیں انھوں نے شہر آشوب اور ذات آشوب کے امتزاج سے اپنی شاعری کا خمیر تیار کیا اس مجموعی آشوب کا تجزیہ کیا جائے تو گھر، آنگن عصری مسائل اور وطنیت کے کئی زاویے منعکس ہوئے ہیں۔ فرد کے آشوب سے اجتماعی آشوب تک بہت سے مسائل ان کے یہاں ایک نظریاتی وابستگی کے ساتھ آتے ہیں۔ فرد کی سطح پر ان کے ہاں جو تضادات آتے ہیں ان کی نوعیت نفسیاتی بھی ہے اور سیاسی و سماجی بھی۔ یہ انفرادی تنہائی اپنے عہد آشوب سے ہم آہنگ ہو کر اجتماعی تنہائی میں بدل جاتی ہے اور جو آج کے انسان کا مقدر ہے یہ تنہائی شروع تو شخصی واردات سے ہوتی ہے لیکن پروین فنا سید نے بڑے سیاسی پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے جس میں عصری جبریت کا احساس نمایاں ہے۔[۷]

پروین فناسید سماج میں موجود بے اعتدالیوں اور فکر و اظہار پر پابندیوں کے خلاف آواز بلند تو کرتی ہیں لیکن ان کے ہاں باغیانہ لہجہ نظر نہیں آتا۔ وہ سماجی برائیوں کو ان کے انجام تک پہنچانا چاہتی ہیں لیکن وہ اس کے لیے ذہنی عمل و شعار کے ذریعے ان برائیوں کو ختم کرنا چاہتی ہیں۔ پروین فناسید نے اپنی شاعری میں انا کو اپنی ہستی کی شناخت کا ذریعہ بنایا ہے۔ ان کی انا انہیں انفرادی خود غرضی یا بغاوت کی طرف لے جانے کی بجائے مثبت انداز میں اجتماعی انا کی تعمیر میں مدد دیتی ہے۔ پروین فناسید اپنی انا سے خود اعتمادی اور مستقبل کے امکانات تشکیل دیتی ہیں۔ علی سردار جعفری پروین فناسید کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

> "پروین فناسید باشعور شاعرہ ہیں ان کے موضوعات حقیقتوں کے احساس سے تراشے گئے ہیں اور یہ احساس شعری پیکروں میں ڈھلتا ہے۔ ان کی نظموں میں پیکروں کی فراوانی ہے۔ میں ان کی شاعری کو محض موضوعات کی شاعری نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک یہ محسوسات کی شاعری ہے لیکن ان کا احساس بیدار اور باشعور ہے۔ اگر ایک طرف ذاتی غموں اور ناکامیوں کو شعر کے قالب میں ڈھالتا ہے تو دوسری طرف اجتماعی غموں کو بھی اپنی خوبصورت گرفت میں لے لیتا ہے۔ یہ شاعری زندگی سے بیزاری کی شاعری نہیں بلکہ زندگی سے محبت کی شاعری ہے۔ ایک فقرے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ پروین فناسید کی شاعری حرفِ حق کے شدید احساس کی شاعری ہے"۔[۸]

ان کے کلام میں سوز و گداز نمایاں ہے۔ ان کے اشعار میں یاسیت کا رنگ دکھائی دیتا ہے۔ وہ سماج میں ہونے والے ظلم و ستم سے پریشان تو ہوتی ہیں لیکن اس ظلم و زیادتی کے ساتھ سمجھوتہ کرنا ان کے مزاج میں نہیں ہے۔ پروین فناسید بین الاقوامی سامراجی استحصالی طاقتوں کی ریاکار چالوں سے اچھی طرح واقف ہیں کس طرح طاقت کے حصول اور حکمرانی کی خواہش نے پوری دنیا میں بھوک، افلاس اور جنگ و جدل کی رسم اتنی عام کر دی ہے کہ ہر طرف تباہی چھائی ہوئی ہے۔ وہ جبر و استبداد کے آہنی ہاتھوں کے خلاف آواز اٹھاتی ہیں۔ ان کی غزلوں میں فکر و شعور نمایاں ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں۔

> "ان کی شاعری مستقبل سے ایک امید اور اعتماد کی شاعری ہے وقت کے ساتھ چلنے کی تمنا، اثبات اور جبر کے خلاف آواز اٹھانے کا یہ رویہ ان کی احتجاجی شاعری میں ایک مثبت لہجے کو ابھارتا ہے اور مایوسی میں امید کی شمع روشن کرتا ہے"۔[۹]

پروین فنا سید کی شاعری میں ایک ایسی عورت جھلک نظر آتی ہے جو عشق و محبت میں پاک بازی کی چادر سر پر اوڑھے ہوئے اپنے سماجی سفر کو جاری رکھے ہوئے ہے، وہ اپنے گھر سے رخصت ہو کر نئے گھر کے آنگن کو خوشیوں اور اپنی وفا کی خوشبو سے بھر دیتی ہے۔ پروین فنا سید کی شاعری اور زندگی کا مرکز آنگن اور آنگن سے متعلقہ چیزیں ہیں، ان کی شاعری کا محور آنگن ہے۔ پروین فنا سید فرسودہ سماجی نظام کے خلاف ہیں وہ اس کو قید تصور کرتی ہیں۔ پروین فنا سید ایک رومانی شاعرہ ہیں ان کے ہاں زندگی سے فرار کی بجائے اس محبت کا رویہ پایا جاتا ہے پروین فنا سید تہذیبی اقدار اور روایات کی امین شاعرہ ہیں۔

پروین فنا سید اور حمیدہ شاہین کی شاعری میں سماجی پہلو مشترک ہیں دونوں نے سماجی بے اعتدالی پر قلم اٹھایا لیکن پروین فنا سید سماجی پابندیوں پر اپنی فکر کا اظہار کرتی ہیں۔ پروین فنا سید کے ہاں بین الاقوامی سامراج کے استحصال کے حوالے سے موضوعات ملتے ہیں جبکہ حمیدہ شاہین کے ہاں ایسے موضوعات نہیں ملتے۔ پروین فنا سید کے ہاں عورت رومانوی انداز میں نظر آتی ہے جو عشق و محبت کے موضوعات میں سموئی ہوئی ہے جبکہ حمیدہ شاہین کے یہاں عشق و محبت میں بھی حدود قیود نظر آتی ہیں۔

۳۔ زہرا نگاہ ۱۹۳۵ء۔

زہرا نگاہ دکن میں ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئیں۔ اردو شاعرات میں سے ایک اہم نام زہرا نگاہ کا ہے۔ ان کے آباو اجداد کا تعلق بدایوں سے تھا۔ ان کو مشاعروں کے ذریعے شہرت حاصل ہوئی کیونکہ اس دور میں مشاعروں کا دور دورہ تھا اور سامعین گھنٹوں کھڑے ہو کر مشاعرے سنتے تھے کیونکہ اس دور میں سامعین جگہ کی عدم دستیابی کی وجہ سے مشاعرے کھڑے ہو کر سننے میں عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ زہرا نگاہ مشاعرے کے اسرار و رموز سے واقف تھیں۔ انہوں نے مشاعرے میں اپنا کلام بھرپور انداز میں پیش کیا جس کی وجہ سے جلد ہی انہوں نے شاعری میں اپنا مقام بنا لیا۔ اس دور کے بڑے شعراء کی طرح زہرا نگاہ کے نام کو بھی مشاعرے کی کامیابی کی علامت سمجھا جانے لگا۔

زہرا نگاہ نے شاعری کا آغاز پچاس کی دہائی میں کیا۔ ان کے ہاں ترقی پسند فکر نمایاں ہے انہوں نے عورت کے حوالے سے کھل کر بات کی۔ ان کی شاعری کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں۔

"وہ بڑے بڑے گھمبیر موضوعات سے بھی اتنی سہولت نمٹتی ہیں جیسے بالکل سامنے کی بات کر رہی ہوں جو لوگ زہرا سے متعارف ہیں وہ ان کی آواز کے بظاہر دھیمے پن اور ان کی شائستگی کے باوجود یہ دیکھ کے حیرت زدہ رہ جاتے ہیں کہ انہوں نے ایک مہیب صورت حال کو ایسے تیکھے اسلوب سے واضح کیا ہے اور ایسی بلیغ رمز سے کام لیا ہے کہ ان کے کلام کا قاری یا سامع اپنے باطن میں دکھ کی تیز دھار لہریں اترتی محسوس کرتا ہے"(۱۰)

زہرا نگاہ کے ہاں فطرت کے موضوع بھی نمایاں ہیں۔ اس کے علاوہ جنگ اور اس کے عوام پر ہونے والے اثرات کے حوالے سے موضوعات زہرہ نگاہ کی شاعری میں ملتے ہیں۔ ان کی نظموں انسانیت کے دل سوز مناظر کی عکاس ہیں۔ جس کی عمدہ مثالیں "ویت نام" اور "جنوبی افریقہ" ہیں نچلے طبقے اور مزدور طبقے کی مجبوریوں بھری زندگی کے حوالے سے بھی ان کی نظموں میں موضوعات موجود ہیں جن میں انہوں نے ان طبقات کی زندگی کے تلخ ایام اور مصیبتوں کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ان کے ہاں ظلم و جبر کے خلاف رد عمل دکھائی دیتا ہے۔ خالدہ حسین رقمطراز ہیں۔

"زہرہ کے ہاں مغربی سامراج کے خلاف صدائے احتجاج ہے جس نے مشرقی کمزور اقوام کو اپنی تجارتی منڈی بنا ڈالا اور انہیں غربت اور قرض کے ایسے شکنجے میں کس کے ڈالا کہ جس نے ان کی سانسوں کو بھی ہچکیوں میں بدل ڈالا ہے"۔(۱۱)

ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں:

"زہرا نگاہ بھی ان اولین شاعرات میں سے ہیں جن کے ہاں خالص عورتوں کا طرز حساس ابھرا ہے غزل روایتی تکنیک اور مستند تلازمات اور استعارات کے ساتھ اگرچہ ایک خاص طرح کی فضا خود بخود جنم لے لیتی ہے لیکن زہرا نگاہ نے اپنے اپنے نسائی طرز احساس اور طرز فکر سے اپنی انفرادیت کی راہ نکالی ہے۔ ان کے ہاں ابتدا سے ہی ایک پختہ فکر کے احساس ملتے ہیں۔ اپنی دوسری ہم عصر شاعرات کی طرح انہوں نے اپنا سفر کچے جذبات اور نو عمری کے کچے پکے خیالات سے شروع نہیں کیا نہ ہی جسم کی ضرورتوں کو اور اشتہاء کو اپنا موضوع بنایا بلکہ ایک کلاسیکی تربیت کی وجہ سے ابتداء ہی سے ان کے یہاں ایک ذہین کی کار فرمائی محسوس ہوتی ہے"۔(۱۲)

کسی بھی شاعر کو اس کی ملکی حالات بہت متاثر کرتے ہیں چاہے وہ حالات اچھے ہوں یا ناساز۔ سماج میں ہونے والی نسلی اور مذہبی تقسیم، خود غرضی اور ناانصافی ہر طرف زہر گھول دیتی ہے۔ زہرا نگاہ کی شاعری میں ہمیں پاکستانی سماج، کراچی کے نامساعد حالات کے حوالے سے موضوعات ملتے ہیں کہ کس طرح ایک پر امن ملک کا خواب دیکھا تھا جو ایک خواب بن کر ہی رہ گیا۔ ان کی نظمیں "ڈاکو" اور "بھیجو بنی جی رحمتیں" ان حالات کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ زہرا نگاہ اپنے عہد کی بھرپور عکاس ہیں ان کی شاعری میں عالمگیر انسانی اقدار ہیں۔ محبت اور رفاقت کے موضوعات کے ساتھ ساتھ سماجی تنقید کی جھلکیاں ہیں۔

زہرا نگاہ اور حمیدہ شاہین دونوں شاعرات نے عورت کے حوالے سے موثر انداز میں کھل کر بات کی ہے۔ حمیدہ شاہین نے اپنی شاعری میں فطرت کے منفی پہلوؤں پر آواز اٹھائی ہے۔ حمیدہ شاہین اور زہرا نگاہ کی شاعری میں انسانیت سوز واقعات کے مناظر نظر آتے ہیں۔ زہرا نگاہ کی شاعری میں زندگی کے رومانی رنگ زیادہ نمایاں ہیں جبکہ حمیدہ شاہین کی شاعری میں اس کے ساتھ ستاتھ حقیقت پسندی کا عنصر نمایاں ہے۔

۴۔ کشور ناہید ۱۹۴۰ء:۔

کشور ناہید نے ۱۳ فروری ۱۹۴۰ء کو اتر پر دیش کے سید گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کے مجموعے کلام میں "لب گویا" (۱۹۴۹ء) ، "بے نام مسافت "(۱۹۷۱ء)، "گلیاں ، دھوپ ، دروازے "(۱۹۷۸ء)"، سیاہ حاشیے میں گلابی رنگ " (۱۹۸۵ء)، فتنہ سامانی دل (کلیات) وغیرہ شامل ہیں کشور ناہید کا شمار پاکستان کی صف اول شاعرات میں ہوتا ہے ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں۔

> "کشور ناہید اپنی نوعیت کی واحد خاتون شاعر، ادیب اور دانشور ہیں۔ وہ ایک ایسی دانشور ہیں جس نے اپنے عورت ہونے کی بجائے اپنے انسانی اور فرد ہونے کو تسلیم کرایا ہے، وہ عورت کو کسی خانے میں رکھ کر پرکھنے کی درپے ہیں نہ دکھانے کی۔ وہ صنفی مساوات کی علم بردار ہیں۔ اس حوالے سے انہوں نے ملک میں ایسا ماحول اور فضا پیدا کی ہے جس میں ادب کے زنانہ اور مردانہ ڈبوں کی تفریق ختم ہو گئی اور ادب تمام انسانوں کا ورثہ بن گیا۔[۱۳]

کشور ناہید کے ہاں عورت کے علاوہ محبت اور وصال کی کیفیتیں بھی موجود ہیں۔ کشور ناہید اصل میں مساوات کی قائل ہیں۔ وہ کسی بھی قسم کی جابرانہ حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتیں بلکہ انہوں نے تو طبقاتی نظام کے خلاف ہمیشہ اپنی آواز بلند کی ہے۔ ان کی آواز پاکستانی سماج میں اس لیے بھی نمایاں تھی کہ پہلی بار کسی عورت کے منہ سے ایسی انقلابی باتیں سننے کو مل رہی تھیں اس وجہ سے کشور ناہید کو بہت جدوجہد کرنی پڑی۔ بے شمار

طعنوں اور ملامتوں کا نشانہ بننے کے باوجود کشور ناہید نے ایک مضبوط عورت ہونے کا ثبوت دیا۔ کشور ناہید کی شاعری میں صرف سطحی مناظر کی عکاسی ہی نہیں بلکہ تجربات کا گہرا شعور ہے۔ غفور شاہ قاسم رقمطراز ہیں:

"کشور ناہید پاکستانی غزل کی نہایت دبنگ اور بلند آہنگ آواز ہے۔ ان کی غزل سے ایک توانا لہجے کا اضافہ ہوا ہے"۔[۱۴]

کشور ناہید کی شاعری میں دور حاضر کا جبر اور ماضی کی روایات اور عورت کی بے بسی کو موثر انداز میں پیش کی ہے۔

بندھے ہیں پیٹ سے بچے بھی اور پہرے بھی
زمیں کی بیٹی کی تصویر دیکھ کر جانا[۱۵]

ان کی شاعری میں عورتوں کے مسائل کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ان کے یہاں تلخ حقیقتوں کے بیان میں باقاعدہ احتجاج کی صورت ملتی ہے۔ کشور ناہید ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں جنہوں نے مختلف اصناف میں اپنا سکہ آزمایا ہے لیکن تمام اصناف میں مقبول ہونے کے باوجود ان کی شاعری کا رنگ نمایاں ہے۔ یہ رجائیت آمیز لہجے کی شاعرہ ہیں۔ کشور ناہید نسائیت کے دائرہ تک محدود نہیں ہیں بلکہ وہ نسائی دائرے سے نکل کر انسانیت کے دکھوں کی ترجمانی کرتی ہیں۔

کشور ناہید برابری کے تعلق کی قائل ہیں۔ حمیدہ شاہین مرد کی برابری کرتے ہوئے بھی عزت و تکریم کی خاطر ایک قدم پیچھے رہنا چاہتی ہیں۔ کشور ناہید کا لہجہ باغیانہ ہے جبکہ حمیدہ شاہین کے ہاں نسوانیت میں رچی بسی انکساری و عاجزی نظر آتی ہے۔ کشور ناہید اور حمیدہ شاہین کی شاعری میں عورتوں کے مسائل کے حوالے سے موضوعات یکساں ہیں لیکن کشور ناہید کے ہاں رویہ شدید احتجاجی ہے جبکہ حمیدہ شاہین کا مزاج نرم اور دھیما نظر آتا ہے۔

۵۔ شبنم شکیل ۱۹۴۶ء-۲۰۱۳ء:۔

شبنم شکیل ۱۹۴۶ء میں لاہور میں پیدا ہوئیں۔ شبنم شکیل سید عابد علی عابد کی صاحبزادی ہیں۔ ایم اے اردو کے بعد شبنم شکیل درس و تدریس کے شعبے سے منسلک ہو گئیں۔ شبنم شکیل نے شاعری کے علاوہ تنقیدی مضامین اور افسانے بھی لکھے۔ انہوں نے شاعری میں دونوں اصناف یعنی غزل اور نظم میں طبع آزمائی کی ہے ۔ علمی گھرانے کا فرد ہونے کے ساتھ بڑے بڑے شعراء کا ساتھ میسر آنے کی وجہ سے شبنم شکیل کے فن میں پختگی پائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں:

"شبنم شکیل ان نوجوان شاعروں میں سے ایک ہیں جن کے ہاں فکر و فن بھی ہے اور زندگی کی صداقتیں بھی، ماضی کی توانا روایات بھی ہیں اور عصری میلانات کی آگہی بھی۔ حال و ماضی کے اسی امتزاج سے انہوں نے شعری کائنات میں ادراک کی قوت و فکر و شعور کی اصالت پیدا کی ہے۔ وہ اپنے ادراک و شعور کو ظاہر و باطن کے تمام محرکات سے مضبوط کر کے شعری تخلیق کو جنم دیتی ہے یہ صلاحیت انہیں ایک مخصوص نسائی لب ولہجہ بخشتی ہے"۔(۱۶)

شبنم کی شاعری میں ہمیں معاشرے کی ناہمواریوں کے موضوعات موجود ہیں۔ ان کی شاعری میں معاشرے کی ناانصافیوں کے تذکرے ملتے ہیں۔ ان کے ہاں حقیقت نگاری ملتی ہے۔ یہ انسانی زندگی کی حقیقتوں کو سامنے لانے کے ساتھ ساتھ زندگی کے پہلو میں چھپی سچائیوں کی متلاشی ہیں۔ شبنم شکیل کے ہاں سماجی مسائل کے موضوعات بھی ہیں۔ ان کے ہاں مستقل حوصلہ اور امید نظر آتی ہے۔ وہ زندگی کی راہوں میں حوصلہ ہارنے کی بجائے سفر جاری رکھنے پر یقین رکھتی ہیں۔ افتخار عارف لکھتے ہیں:

"صدیوں کی طرز و طور زندگی، مقرر شب و روز، معین مراحل و منازل اور مقرر معیار و اقدار سب اس بات پر گواہ ہیں کہ مشرق کی عورت آزادی اور بیداری نسواں کے تمام دعووں اور نعروں کے باوجود مجبور اور مظلوم رہی ہے گزشتہ چند دہائیوں سے عالمی سطح پر ہونے والے معاشرتی تبدیلیوں اور روشن خیالی اور فرد افروزی کی تحریکوں کے زیر اثر اور اپنی شناخت کی مسلسل اور متواتر جدو جہد کے نتیجہ میں اپنی آواز کی انفرادیت کو جاننے، منوانے اور قائم رکھنے میں کامیاب ہوئی ہے"۔(۱۷)

شبنم شکیل کی شاعری میں عورت کے حوالے سے ایک اور رجحان دیکھنے کو ملتا ہے کہ مرد اسے تمام سہولیات دے کر اس کے بدلے میں عورت کی آزادی سلب کر لیتا ہے۔ ان آسائشوں کے بدلے عورت کو اپنی خواہشات، عزت اور انا گروی رکھ دیتی ہے۔ وہ اپنی مرضی سے زندگی نہیں گزار سکتی یعنی عورت کی اپنی انا اور خودداری نہ ہونے کے برابر ہے۔

شبنم شکیل کے ہاں صرف اپنی ذات کی آگہی نہیں ہے بلکہ ان کے ہاں اردگرد کے ماحول کا گہرا شعور نمایاں ہے انہوں نے ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا جن پر دوسری شاعرات شائد جھجک کر رہ جائیں۔

شبنم کے اسلوب میں روایت سے ہٹ کر انفرادی رنگ رچے بسے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی شاعری کے تخلیقی تجربے میں عورت کی روزمرہ زندگی سے جڑے موضوعات پر قلم اٹھاتی ہیں۔ خالدہ حسین لکھتی ہیں۔

"شبنم کی انفرادیت یہ ہے کہ اس نے ایک مخصوص رکھ رکھاؤ والی گھریلو مگر پختہ شعور و آگہی اور عصری مسائل پر گہری نظر رکھنے والی عورت کے حوالے سے اپنی روزمرہ زندگی کے تجربات و واقعات کو شاعری کا موضوع بنادیا۔ اس کی انفرادیت جہاں موضوع میں نمایاں ہے وہیں طرز ادا میں بھی متوجہ کرتی ہیں عورت کی زبان میں شاعری کی کوئی اچھی روایت کلاسیکی شاعری میں نظر نہیں آتی۔ کیسے نظر آئے کیوں کہ تب عورت بھی صیغہ مذکر میں بات کرتی تھی۔ شبنم نے تانیثیت کو فنکارانہ اعتبار بخشا۔ اس کے لہجے میں نسوانیت کی کھنک بھی ہے اور دردمندی بھی کہیں کہیں قوسِ قزح کے رنگ بھی کھلتے ہیں اور موسیقی کے سُر بھی اپنا جادو جگاتے ہیں"۔[۱۸]

ایک اور جگہ خالدہ حسین لکھتی ہیں:

"عصری حسیت بھی شبنم کے کلام کا اہم جزو ہے اس کے اشعار انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں کی خبر دیتے ہیں۔ ماحول کی گھٹن حالات کی تلخی۔ اور جبر و استبداد کا چلن۔ عام انسان کی بے قدری اور تحقیر۔ زر پرستی۔ مطلب پرستی اور طالع آزمائی کے رجحانات۔ اظہار پر کڑی پابندیاں۔ یہ سب تجربات ایک تلخ معاشرے اور سیاسی چیرہ دستی کی خبر دیتے ہیں۔"[۱۹]

شبنم شکیل اور حمیدہ شاہین کے ہاں عصری اور سماجی مسائل کے حوالے سے قدر مشترک موضوعات دکھائی دیتے ہیں شبنم شکیل کے ہاں حوصلے اور امید کی نمایاں جھلک موجود ہے شبنم شکیل عورت کے حقوق سلب کرنے کے حوالے سے اپنی آواز بلند کرتی نظر آتی ہیں جبکہ حمیدہ شاہین کی شاعری میں عورت کے حقوق کے حوالے سے ایک الگ رجحان نظر آتا ہے۔

۶۔ فہمیدہ ریاض ۱۹۴۵ء:۔

فہمیدہ ریاض ۲۷ جولائی ۱۹۴۵ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "پتھر کی زبان" کے نام سے منظر عام پر آیا۔ ان کے مجموعہ کلام میں "بدن دریدہ"، "دھوپ"، "کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے، ادھورا آدمی"، "ہم رکاب، اور اپنا جرم ثابت ہے" جبکہ "میں مٹی کی مورت ہوں" کے نام سے ان کا

کلیات شائع ہو چکا ہے۔ فہمیدہ ریاض کی کی نسائی فکر و شعور ان کی شہرت کی وجہ بنا۔ البتہ ان کے پہلے مجموعے میں کہیں کہیں رومانیت کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ڈاکٹر امین فہمیدہ ریاض کی شاعری کے بارے میں " صنف نازک کی شاعری "میں لکھتے ہیں:

"فہمیدہ ریاض نظم میں منفرد مقام رکھتی ہے۔اس کی شاعری احساسِ بغاوت سے جنم لیتی ہے اور احتجاج بن کر شعری پیکر میں ڈھلتی ہے۔وہ نسوائیت کی خود بے رحمی کا شکار نہیں ہوئی یا اس نے مرد کے معاشرے میں اپنی مظلومیت کا رونا نہیں رویا بلکہ احتجاج کے ذریعے سے اپنے وجود کو منوایا ہے۔نسوائی ادب میں اس کی نظمیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ نسوائی ادب میں اس کی نظمیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں اس نے مختلف حوالوں سے نسوانی وجود کو اجاگر کیا ہے اور معاشرتی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کیا ہے"۔(۲۰)

فہمیدہ ریاض نے جب شاعری کا آغاز کیا۔ اس زمانے میں ترقی پسند تحریک کی لہر رواں دواں تھی۔ ان کی ہم عصر شاعرات نے غزل کو ذریعہ اظہار بنایا جبکہ فہمیدہ ریاض نے نظم کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ فہمیدہ ریاض اردو شاعرات میں وہ پہلی شاعرہ ہیں جنہوں انقلابی کروٹ لی جبکہ ان کے پہلے مجموعے میں ہمیں رومانوی اثرات نظر آتے ہیں۔ جس میں انہوں نے عورت کے احساسات و جذبات اور محبت کو موضوع بنایا۔ خالد حسین لکھتے ہیں۔

" فہمیدہ فطری طور پر ایک باغی عورت ہے وہ اپنے موضوعات اور احساسات پر کوئی قدغن شروع ہی سے برداشت نہیں کرتی چلی آئی۔وہ رسم ورہ عام سے صرف کلیشے کے طور پر ہٹ کر نہیں چلتی بلکہ ایقان ہے کہ زندگی تصورات پر نہیں۔ تجربات پر بسر ہونا چاہیے"۔(۲۱)

فہمیدہ ریاض وہ پہلی شاعرہ ہیں جنہوں نے نسائی حسیت کی بدولت جلد ہی اردو شاعری میں اپنا منفرد مقام پیدا کر لیا۔ ان سے پہلے اردو شاعری میں خالص نسائی تجربات اور محسوسات کے موضوعات نظر نہیں آتے۔ ان کے ہاں سماجی جبر کے خلاف احتجاج ملتا ہے۔ فہمیدہ ریاض نے سماج میں ہونے والے ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھائی بغاوت کی۔ اس بغاوت کے بدلے میں ہر موڑ پر مشکلات، رکاوٹیں اور طعنے نصیب بنے مگر وہ بڑے حوصلے سے اپنی منزل کی جانب گامزن رہیں کیونکہ وہ جانتی ہیں مجہول زدہ معاشروں میں شعور کی آگہی

کسی بڑے جرم سے کم نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وہ خاموش رہ کر اس ظلم کا حصہ بننے کی بجائے اس کے خلاف بغاوت کا اعلان کرتی ہیں۔ڈاکٹر سلیم اختر رقمطراز ہیں۔

"فہمیدہ ریاض ملامت، جبر اور گھٹن کی پیدا کردہ ذہنی پسماندگی کی فضا میں تخلیقی سفر طے کر رہی ہے۔ پاکستانی مردوں کے تنگ نظر معاشرہ میں فہمیدہ ریاض اپنی نسوانیت سے خوفزدہ ہونے کے برعکس اسی کو اپنا سب ہتھیار بنا کر اپنی شرائط پر زندگی بسر کر رہی ہیں جو کہ بذات خود بہت بڑا جہاد ہے۔"(۲۲)

فہمیدہ ریاض کے ہاں سیاسی شعور نمایاں ہے وہ ملکی سیاست اور اس کی سیاسی چال بازیوں سے بخوبی واقف ہیں اسی طرح وہ بیوروکریسی اور مارشل لا کے مکروفریب کی عمدہ تصویر اپنی شاعری میں پیش کرتی ہیں ان کے ہاں سیاست کا نظریہ و شعور دیگر شاعرات کے برعکس خاصا مستحکم ہے اپنے وطن اپنی مٹی کے ساتھ محبت ان کی شاعری میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے وہ اپنے عہد کی بیشتر اور سیاسی اور سماجی تحریکوں سے وابستہ رہی ہیں۔بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

"فہمیدہ ریاض کا باغیانہ لہجہ فیشن کی بناء پر نہیں بلکہ یہ شعور حیات کے ساتھ ساتھ شعارِ زیست بھی ہے۔"(۲۳)

فہمیدہ ریاض ایک باعمل شاعرہ ہیں جو استحصال زدہ طبقوں کی نمائندگی کے ساتھ ساتھ ان کی عملی مدد کے لیے کبھی پیچھے نہیں رہتیں ۔ فہمیدہ ریاض کی آواز باقی شاعرات کے لحاظ سے نہایت بلند و بے باک ہے۔ان کے یہاں خالص نسائیت کے تجربات ملتے ہیں۔ اسی طرح حمیدہ شاہین کی شاعری میں دیکھا جائے تو ان کے یہاں بھی تانیثیت کے حوالے سے نمایاں موضوعات موجود ہیں۔ حمیدہ شاہین اور فہمیدہ کی شاعری میں سماجی اور سیاسی شعور کی جھلک واضح ہے۔ دونوں شاعرات کی کی شاعری میں طبقاتی تقسیم اور استحصال کے حوالے سے بھی موضوعات نظر آتے ہیں۔

۷۔شائستہ حبیب ۱۸ نومبر ۱۹۴۶ء:۔

شائستہ حبیب ۱۸ نومبر ۱۹۴۶ ء کو پورن نگر سیالکوٹ میں پیدا ہوئی۔ ان کے مجموعہ کلام "سورج پر دستک" اور "کپاہ تے چانن" ہیں شائستہ حبیب جدید لب ولہجے کی ایک ایسی شاعرہ ہے جنہوں نے نثری نظم کو اپنے خیالات کے اظہار کا زریعہ بنایا ہے ان کے ہاں ترقی پسند فکر کے موضوعات نمایاں ہیں ڈاکٹر سعادت سعید صنف نازک کی شاعری میں شائستہ حبیب کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"شائستہ حبیب ہمارے عہد کی شاعرہ ہیں روایت شکن بھی اور روایت ساز بھی۔ وہ شعری اظہار اور موضوعاتی ترسیل کے معاملے میں گائیڈڈ میزائل کی ہمسفر نہیں ہیں۔ ان کا فکری بہاؤ جذباتی تحرک، احساساتی لاوا، متعینہ منازل پر پہنچنے کی بجائے تخیل اور تجربہ کے کھلے میدانوں میں رم کرتا دکھائی دیتا ہے"۔(۲۴)

شائستہ حبیب کے ہاں نظموں میں باطنی واردات اور تجربات اتنے واضح انداز میں بیان ہوتے ہیں کہ ان میں پیچیدہ علامتیں اور تمثیلیں تفہیم میں حائل نہیں ہوتی۔ ان کے ہاں متنوع موضوعات پر نظمیں موجود ہیں وہ سماجی حقیقتوں کو کسی ڈھکے چھپے انداز میں بیان نہیں کرتیں بلکہ وہ اپنی نثری نظم میں وضاحتی انداز اپناتے ہوئے ساری داستان بیان کر دیتی ہیں۔ وہ بے بس نسلوں کے المیوں اور کچلی ہوئی روحوں پر پریشان ہونے کی بجائے محبت اور روایات کو ان کا حل سمجھتی ہیں وہ جاگیر دارنہ طبقے کو کوڑھ زدہ وجود تصور کرتی ہیں جو اپنے لہو کا اخراج تک غریبوں اور محنت کشوں سے لیتے ہیں لیکن عیش و عشرت میں جینے والے تنگ گلیوں میں اگتی بھوک سے بے خبر ہیں۔ ڈاکٹر سعادت سعید لکھتے ہیں۔

"شائستہ حبیب کی توجہ صناعی کی جانب ہے نہ ہی اسلوب کے بناؤ سنگھار پر۔ لفظوں کی نشست و برخاست کا ریاضت طلب مسئلہ بھی اس کے لیے اہم نہیں ہے۔ وہ خیالی اور جذبے کے بہاؤ میں بہتی ہیں اور ہر نوع کے الفاظ برتتی ہوئی اپنے مفاہم کا ادراک دیتی ہیں۔ اس کی نظمیں اس کے سچے اور حقیقی تجربوں کی نظمیں ہیں اور اس نے انہیں اپنی تمام تر شاعرانہ بصیرت کے ساتھ تخلیق کیا ہے"۔(۲۵)

شائستہ حبیب کے ہاں تانیثی فکر بھی پائی جاتی ہے ان کو عزت، غیرت اور خونی رشتوں کی وجہ سے بکتی عورت کا وجود قبول نہیں ہے جبکہ شائستہ حبیب کا سب سے بڑا موضوع "محبت" ہے ان کے موضوعات کے بارے میں ڈاکٹر سعادت سعید رقمطراز ہیں۔

"شائستہ کی ان نظموں میں وجودی رشتوں کی بھرپور شکلیں اجاگر ہوئی ہیں۔ ابلاغ، آزادی، کومٹ منٹ، موت اور زندگی کی جدلیات بے معنویت، بنجر پن، ریبلین، احتجاج، مزاحمت، محبت، وجود اور سیاست، وجود اور معاشرت، وجود اور موجود کی آویزش، اداسیاں، بے ہنگم کام، بے آس تنہائیاں، انسانوں کے مابین فاصلے، بھوک، ناداری، غربت، ارتقاع کی تمنا، اپنے نہ ہونے میں ہونا اور ہونے میں نہ ہونا، جرم و سزا، عدم و وصال، روحوں کے نیلام گھر، اجنبیت، قید خانے، جلاوطنی، افیونی قدریں، سرد

مہریاں، خود بوئی، سکھ کی تلاش، سچے اور آراستہ وجودوں کی بربادیاں، خود شناسی، صدمے، بے چینیاں، جینے کی جدوجہد، خواب اور حقیقت کا اتصال، ڈر، دہشت، مردہ لاشیں اور گدھ، انسانی آرزؤں کی کی تاراجی اور اس قسم کے دیگر لاتعداد تاثرات، تلازمات اور موضوعات ان کی نظموں کی نیت میں شامل ہیں"۔(۲۶)

شائستہ حبیب نے نئی نظم کے علامتی اور استعاراتی نظام کو نہایت خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ انہوں نے نثری نظم کی تکنیک کو اپناتے ہوئے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے۔ ان کی نظموں کے جملے مکمل اور ان کی شاعرانہ مہارت کا ثبوت ہیں۔ بے ساختگی اور روانی شائستہ حبیب کی نظموں کی خصوصیات ہیں۔ ان کی نظموں کے جملے نہ صرف اپنی معنویت کے لحاظ سے مکمل ہیں بلکہ وہ زندگی خوشی، امید اور حوصلے کا پیغام بھی دیتے ہیں۔ شائستہ حبیب نے اپنی نظموں میں زندگی کی حقیقتوں کو نثری نظم کے کینوس پر اتار کر ان میں جذبات کا خوبصورت رنگ بھر دیا ہے۔ ان کی نظمیں نئے اور منفرد تجربات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔

حمیدہ شاہین اور شائستہ حبیب کی شاعری میں طبقاتی استحصال اور سماجی تقسیم نمایاں خصوصیت ہے۔ تانیثی فکر و شعور حمیدہ شاہین اور شائستہ حبیب کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ ان دونوں کی شاعری میں بنیادی فرق یہ ہے کہ شائستہ حبیب کا نمایاں موضوع محبت ہے اور حمیدہ شاہین کا نمایاں موضوع نسائیت ہے۔

۸۔ نسرین انجم بھٹی ۱۹۴۸ء:۔

نسرین انجم بھٹی ۲۶ جنوری ۱۹۴۸ء کو کوئٹہ میں پیدا ہوئیں ان کے مجموعہ کلام میں "نیل کرایاں نیلکاں، "۱۹۸۵"، موراتن تم بن جیا اداس (۱۹۸۸ء) اور "بن باس" شامل ہیں۔ اردو شاعرات میں نسرین انجم بھٹی اپنے تلخ اسلوب اور احتجاجی انداز کے باعث اپنی ایک الگ پہچان رکھتی ہیں۔ انہوں نے اردو اور پنجابی دونوں زبانوں کو ذریعہ اظہار بنایا ان کے ہاں ترقی پسند فکر اور نسائی شعور موجود ہے۔ غلام حسین ساجد لکھتے ہیں۔

"نسرین انجم بھٹی کی نظموں کا لہجہ بظاہر دھیما اور شگفتہ ہے کہ اس کے باطن میں سلگتی پگھلا دینے والی آنچ کی خبر بہت دیر میں ہوتی ہے، نسرین کی شاعری کو با آسانی ایک ایسی خود کلامی کا نام دیا جاسکتا ہے جس کی ساخت میں صاف ہمکلامی اور خارجی آوازوں کا باہم اتصال بنیادی حیثیت رکھتا ہے اس کی نظموں میں ایسے تلازموں کی بہتات ہے، جو ان نظموں کے دھیمے پن کو اپنے عہد کی احتجاجی آواز بنانے پر مصر ہی نہیں بلکہ اپنے عہد کی اساطیر، وراثت تمثیل اور حقیقی اظہار کا پیش رو بنانے پر بھی کاربند ہیں"۔(۲۷)

نسرین انجم بھٹی نے اپنی شاعری میں جن موضوعات پر احتجاج کا انداز اپنایا۔ انہیں اپنی تشبیہات و استعارات کے ذریعے خوبصورت بنانے کی کوشش نہیں کی بلکہ تلخ تجربات و موضوعات کو تلخ ہی رہنے دیا۔ انہوں نے براہ راست تنقیدی انداز اختیار کیا ہے۔ نسرین انجم بھٹی اپنے ارگرد کے حالات میں انسانوں کی بے بسی اور خود غرضی پر شدید احتجاج کرتی ہیں۔

نسرین انجم بھٹی کے ہاں موجود زندگی کی تلخیوں اور بے معنویت کے موضوعات ملتے ہیں۔ ان کے بقول خارجی جبریت کی گرد شیں انسان کو اندر ہی اندر ختم کرتی جاتی ہے۔ ہر قدم پر استحصال ہونا، انسانیت سوز اور شرم ناک مناظر انسانی اقتدار کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ یہ عمومی رویہ نسرین انجم بھٹی کی شاعری میں مختلف کیفیتوں میں سامنے آتا ہے۔ بقول غلام حسین

> "نسرین انجم بھٹی کی نظم، نئی شعری لسانیت عصری شعور اور معنویت کی نئی سرحدوں پر بہتی ہوئی ایک ایسے عہد کی جانب رواں ہے، جو اس کا اپنا عہد ہے، اپنا خواب ہے۔"(۲۸)

نسرین انجم بھٹی سماج میں منفی امتیازات کے خلاف آواز بلند کرتی ہیں۔ ان کے یہاں انسانی استحصال کے حوالے سے نظمیں ملتی ہیں۔ ان کی نظموں میں ہمیں تلخی اور کڑواہٹ نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کی نظمیں بن ماس، آدھی نظم، ریت کے سفر پر، اور "زمین" وغیرہ عمدہ مثالیں ہیں۔ اسی طرح نسرین انجم کے ہاں انتظار، ہجرتوں اور محبتوں پر بھی بے شمار اشعار موجود ہیں لیکن نسرین انجم ترقی پسندانہ خیالات کی حامل شاعرہ ہیں۔ ان کے ہاں اردو سے زیادہ پنجابی زبان کا عنصر نمایاں ہے۔ ان کی نظم ہیتی تشکیل اور موضوعاتی دائرہ کار ترقی پسندانہ شاعروں کی معینہ روش سے ہٹ کر ہے۔ نسرین انجم بھٹی نے اپنی نظموں میں صنعت ابہام کا استعمال کیا ہے۔ انہوں نے اپنے موضوعات کی بہتر ترسیل کے لیے موقع کی مناسبت کے مطابق ہندی، انگریزی، پنجابی، فارسی، عربی، زبان کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ نسرین انجم بھٹی کے ہندی اسلوب اور پنجابی آہنگ نے ان کی نظموں کو مخصوص انفرادیت عطا کی ہے۔ غلام حسین رقمطراز ہیں:

> "نسرین انجم بھٹی اپنی شاعری کی مدد سے ایک ایسے ماحول کی تعمیر میں مصروف ہیں جہاں وہ اپنی نسل، طبقے، اپنی قوم اور اپنے وجود کو از سر نو تشکیل کے مرحلے سے گزرتا دیکھنا چاہتی ہیں۔ ان کی نظموں میں ایک ایسا لینڈ اسکیپ نمو پاتا دکھائی دیتا ہے، جس کی حقیقی شکل کہیں موجود نہیں اور اس کی اکثر نظموں میں شاعرانہ ابہام ایک لازمی ترکیبی عنصر کی شکل میں سامنے آتا ہے۔"(۲۹)

حمیدہ شاہین اور نسرین انجم بھٹی نے اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے حمیدہ شاہین کے ہاں اردو زبان نمایاں ہے ،دونوں شاعرات کے ہاں نسائی شعور موجود ہے۔ نسرین انجم بھٹی کے ہاں تلخ موضوعات چاشنی کی چادر میں لپٹے ہوئے نظر نہیں آتے بلکہ وہ تلخ موضوعات کو تلخ انداز میں بیان کرتی ہیں۔ حمیدہ شاہین اور نسرین انجم کے یہاں انسانی رویوں اور انسانی استحصال کے حوالے سے موضوعات یکساں ہیں۔

۹۔پروین شاکر (۱۹۵۶ء- ۱۹۹۴ء):۔

پروین شاکر ۲۴نومبر ۱۹۵۲ء کو کراچی میں پیدا ہوئیں ۔انہوں نے انگریزی میں ایم اے کیا اور اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہوئیں۔ ۱۹۹۴ء میں ان کی وفات ایک حادثے میں ہوئی۔ ان کے مجموعہ کلام میں "خوشبو"، "صدبرگ"، "خودکلامی"، "انکار" اور "بات شناسائی کی" کی شامل ہیں جبکہ ماہ تمام کے نام سے ان کا کلیات بھی شائع ہو چکا ہے۔ پروین شاکر جدید اردو شاعری کی مقبول ترین شاعرات کی فہرست میں اپنے لیے ایک خاص مقام بنا چکی ہیں۔ ان کی شاعری میں فطرت پسندی، مشرقی اقدار کی ترجمانی، فرسودہ سماجی اقدار سے بغاوت اور شخصی محبت کے تجربات و نا آسودگی سے پیدا ہونے والی کیفیت و احساسات کے موضوعات ہیں۔ پروین شاکر ایک اعلیٰ فکر اور حساس عصری و سماجی شعور کی حامل شاعرہ ہیں جن کی ذاتی وارداتوں کے علاوہ سماجی المیوں پر بھی گہری نظر ہے۔ محمد علی صدیقی صنف نازک کی شاعری میں پروین شاکر کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

> پروین کی شاعری میں سانپ بن کر ڈسنے والی تنہائی اور اجتماعی بلند حوصلگی کی خواہشوں کے علیحدہ علیحدہ خانے نہیں ہیں جو کچھ ہے اور جیسا ہے کفایت لفظی کے ساتھ سپرد قلم کر دیا جاتا ہے لیکن کچھ اس طرح کی زندگی پر پیار آجاتا ہے۔ پروین شاکر کم عمری ہی میں رجحان ساز شاعری کا روپ دھارتی نظر آرہی ہیں اور یہ بذات خود قابل مبارک کامیابی ہے"۔(۳۰)

پروین شاکر اپنی شاعری میں ایوان اقتدار کی غلطیوں کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بناتی ہیں۔ ان کی شاعری کا منفرد وصف اس کا عورت ہوتے ہوئے ایک فرد یعنی ایک مکمل انسان کی حیثیت میں سوچنا ہے۔ پروین شاکر بنیادی طور پر رنگوں، پھولوں، خوشبوؤں اور محبتوں کی شاعرہ ہے جبکہ ان کا پسندیدہ موضوع "محبت" ہے۔ پروین شاکر کے ہاں دو سطحوں پر احتجاج نظر آتا ہے ایک معاشرہ کے عام فرد کے حوالے سے اور دوسرا عورت کی نمائندگی کے حوالے سے۔ پروین شاکر کے نسائی جذبات کا نسائی لہجے اور نسائی آہنگ میں بیان اور رومانیت

ان کا اختصاص ہے ان کی شاعری میں خالص نسائی تمثالیں، دلہن، حنا، سیج، چوڑیاں، بندیا، سبھی کا تذکرہ موجود ہے پروین شاکر چاہے بیورور کریٹ اور سماجی نقاد ہی کیوں نہ بن جائیں بنیادی طور پر وہ ایک روایتی عورت ہیں۔ غفور قاسم شاہ لکھتے ہیں:

> "مشک نافہ کی سچی شاعری کرنے والی عورت پروین شاکر نے جذبوں کی مٹھی کھول کر رسیلے اور سبک الفاظ میں صاحبان ذوق کو پکارا۔ اپنی تخلیقی انفرادیت کے سبب پروین شاکر نے نوجوان نسل کے شعراء اور شاعرات کی مزاج سازی میں اہم کردار ادا کیا"۔ (۳۱)

پروین شاکر کے ہاں عصری مسائل کا گہرا ادراک نمایاں ہے۔ ان کی نظموں میں سماجی فکر و نظر کا اظہار ملتا ہے ان کی نظموں میں تلخی سے سے بھرپور سماجی جبر، منفی اور منافقانہ رویوں کے خلاف جہاد نظر آتا ہے۔ پروین شاکر کی شاعری میں داخلیت اور حسن لطافت کا خوبصورت اظہار ملتا ہے۔ انہوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کو ذاتی جذبہ و احساس سے ہم آہنگ کر کے پوری فنی قدروں کے ساتھ برتا ہے۔ ان کی شاعری میں صحت مند رومانوی خصائص کا ایک مجموعہ ہے جس پر عہدِ جدید کی شاعرات نے اپنی رومانوی فکر کی بنیادیں استوار کیں۔ جبکہ ان کا مجموعہ "انکار" ان کے بھرپور عصری شعور کی عکاس ہے۔ اس میں ایک ان نیا روپ سامنے آیا۔ ڈاکٹر فتح محمد لکھتے ہیں۔

> "پروین شاکر بہت چھوٹی صداقتوں سے بڑی صداقتوں کا رخت سفر باندھ کر بدن کی سوچ اور سوچ کے بدن کی شاعری سے آگے منزلوں کی تمنائی بن جاتی ہیں اب ان کی شاعری فقط نسائی جذبوں کی ترجمانی کی بجائے ایک حساس اور باشعور شخص کے انسانی خوابوں کی ترجمان بن جاتی ہے"۔ (۳۲)

اس مجموعہ کلام سے بیشتر نظمیں مزاحمتی نوعیت کی ہے جن میں دم توڑتی انسان قدروں کا بین اور انسانی سماج کی بنیادوں کو کھوکھلا کر کے ختم کرتی ہوئی اقدار کو پروین شاکر نے اپنا موضوع بنایا ہے اور وہ ایسی شاعرہ ہیں جو حکام اعلیٰ کو ان کی غلطیوں پر سرزنش کرتی ہیں۔ اس سے بلند و بانگ لہجے میں مخاطب ہوتی ہوئی انہیں ان کے فرائض یاد دلاتی ہیں۔

پروین شاکر اور حمیدہ شاہین کی شاعری میں مشرقی اقدار اور سماجی اقدار کے موضوعات یکساں ہیں عصری اور سماجی شعور و المیوں پر دونوں شاعرات کی گہری نظر ہے اسی طرح دونوں کے ہاں نسائی رجحان نظر آتا ہے پروین شاکر کے ہاں نسائی رجحان کے علاوہ رومانیت کا رجحان بھی سامنے آتا ہے۔

۱۰۔شاہین مفتی ۱۹۵۲ء:۔

شاہین مفتی اردو شاعری میں دورِ جدید کی نمائندہ شاعرہ ہیں۔وہ شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ تنقید نگار بھی ہیں۔شاہین مفتی نے جدید نظریات کے مکمل علمی پس منظر کو سمجھتے ہوئے اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے۔بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دو اصناف میں بیک مقبولیت حاصل کریں ایسے لوگوں میں شاہین مفتی کا بھی شمار ہوتا ہے جنہوں نے بیک وقت دونوں میدانوں میں مقبولیت حاصل کی۔شاہین مفتی کے دو مجموعے "امانت" اور "مسافت" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں جو صرف نظموں پر مشتمل ہیں۔شاہین مفتی نے جدیدیت کے زیر اثر جنم لینے والے تمام ادبی رجحانات اور فنی لوازمات کو سمجھتے ہوئے اپنی شاعری کے لیے وجودی فلسفہ و فکر کا انتخاب کیا ہے۔ان کی نظمیں انتہائی مختصر ہونے کے باوجود مکمل ہیں انہیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ لفظ انتہائی سوچ سمجھ کر برتے گئے ہیں۔ شاہین مفتی کی نظموں کا اختصار ہی ان کی نظموں کی خصوصیت ہے۔ محمد افسر ساجد شاہین مفتی کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

> "شاہین مفتی بنیادی طور پر نظم کی شاعرہ ہیں ان کی نظم معنوی اعتبار سے دو پرتوں پر مشتمل ہوتی ہے ذاتی اور معروضی۔ذاتی سطح پر شاہین مفتی اپنی نظموں میں اپنے دکھوں کا برملا اظہار کرتی ہیں دوسری سطح شعور کی سطح ہے غم ذات کی غلام گردشوں سے نکل کر غم دوراں کو اپنی نظموں کا موضوع بناتی ہیں اسی وجہ سے شاہین مفتی جدید نظم نگاروں میں ایک مقامِ امتیاز کی حامل ہیں۔ تفکر، حسن لطافت، ڈکشن اور امیجری کے اعتبار سے انہیں یقیناً اپنی کئی ہم صنف معاصرین پر فوقیت حاصل ہے"۔(۳۳)

شاہین مفتی کے ہاں "محبت" نمایاں موضوع ہے۔شاہین مفتی کی شاعری میں خواب ایک مستقل حوالہ ہیں کیونکہ ان کے مطابق زندگی ایک ایسا خواب ہے جس میں رابطے منقطع ہونے کا خدشہ اور بچھڑنے کا خوف ہر وقت لگا رہتا ہے۔ان کے ہاں خوشی کے لمحات کے بیان کی بجائے دکھ اور دکھوں کے تمام حوالے جگہ جگہ ان کی شاعری میں موجود ہیں۔ہجرتوں اور فاصلوں نے شاہین مفتی کے اندر دکھ کو لا کر بٹھا دیا ہے لیکن ان کی شاعری میں دکھ کے اظہار میں بھی امیجز کی تازگی نظر آتی ہے۔شاہین مفتی کا سماجی و عصری شعور بھی ان

کی باطنی کیفیات سے مزین ہے۔شاہین مفتی کے ہاں سماج کے حوالے سے مکمل طور پر نفی رویہ موجود نہیں ہے ،وہ محبت کی علمبر دار ہوتے ہوئے بھی اپنے ارد گرد کے حالات سے بے خبر نہیں رہتی۔وہ اپنی نظموں میں الفاظ کے بر محل استعمال سے خوب واقف ہیں۔ان کی نظموں میں الفاظ جذبات کی ترجمانی کے لیے خود بخود جگہ بناتے جاتے ہیں۔ان کی شاعری میں موسیقت اور ترنم نمایاں ہے جو عہد حاضر کی نظموں میں کم و بیش ہی ملتا ہے۔ان کی شاعری عصری رجحانات کی عکاس ہے جس میں جدیدیت کے پس منظر میں کلاسیکی روایات کا گہرا شعور ہے۔ ان کی نظموں کے استعارے اور علامتیں معنیٰ خیز ہیں ۔شاہین مفتی مشکل سے مشکل موضوعات کو نہایت سادہ اور مختصر الفاظ میں بیان کرنے کے ہنر سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کی نظموں میں خارجی جبریت کی بدولت انا اور خوابوں کی شکست کے ساتھ مایوسیوں کے سائے جھملاتے نظر آتے ہیں ۔شاہین مفتی اردو شاعرات میں جدیدیت کے ایک فکری زاویے اور وجودیت کی بہترین مثال ہیں۔

رابطوں کی دنیا میں
لفظ ہی وہ رستہ ہے
حرف اور معنی کی
ریشمیں طنابوں پر
ہاتھ جب پھسلتے ہیں
ساتھ چھوٹ جاتا ہے
دور جا نکلتے ہیں(۳۴)

شاہین مفتی کی شاعری میں وجودیت اور جدیدیت کے رجحانات نظر آتے ہیں جبکہ حمیدہ شاہین کی شاعری میں یہ رجحانات نہیں ملتے۔شاہین مفتی کی شاعری میں محبت نمایاں موضوع کے طور پر سامنے آئی ہے حمیدہ شاہین اور شاہین مفتی کی نظموں میں سماجی اور عصری شعور کے رجحانات یکساں موجود ہیں۔

۱۱۔فاطمہ حسن ۱۹۵۳ء:۔

فاطمہ حسن کا اصل نام سیدہ انیس فاطمہ ہے جبکہ ان کا قلمی نام فاطمہ حسن ہے۔ فاطمہ حسن ۲۵ جنوری ۱۹۵۳ء میں کراچی میں پیدا ہوئیں۔انہوں نے ایم اے جرنلزم میں کیا۔ان کا مجموعہ کلام "بہتے پھول " (۱۹۷۷ء) ،دستک سے در کا فاصلہ (۱۹۹۳ ء) (شعری مجموعے)،"یادیں بھی اب خواب ہوئیں (شعری مجموعے)کے نام سے شائع ہوئے۔جبکہ "یاد کی بارشیں" کے نام سے ان کا کلیات منظر عام پر آیا۔اسّی

کی دہائی میں منظر عام پر آنے والی فاطمہ حسن جدید اردو شاعری کی نمائندہ ہیں۔ فاطمہ حسن نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ جن میں افسانہ، غزل، پابند نظم، آزاد نظم، نثری نظم اور ہائیکو شامل ہیں۔ فاطمہ حسن کی شاعری میں ان کی قلبی واردات کے اظہار کے ساتھ ساتھ آفاقی جذبے اور رویے کا عکس ہے۔ ان کے ہاں روایتی اسلوب کے ساتھ جدید اصطلاحیں بھی موجود ہیں۔ غلام حسین ساجد لکھتے ہیں:

"فاطمہ حسن نے اسلوب موضوعات اور لسانی آہنگ وضع کرنے کی سطح پر کسی نوع کی بغاوت نہیں کی۔ وہ شاعری کے دھارے میں اس طور شامل ہو گئی ہیں جیسے ندیاں دریا میں آملتی ہیں یا جیسے کنار دریا پر موجود درختوں سے بچھڑنے والے پھول پانی کے دھارے پر بکھر جاتے ہیں۔ اس نے بے حد دھیمے لہجے میں کوئی ہلچل مچائے بغیر چند بنیادی سوال اٹھائے ہیں جو انسانی مقدر کی شناخت کے لیے بنیادی اہمیت کے حامل ہیں اور جن کی تلاش کرنے کی خواہش ہر ذی شعور کو ہے"۔ (۳۵)

فاطمہ حسن کی شاعری میں غنائیت اور ترنم بھرپور ہے۔ ان کی شاعری میں محبت، معاشرتی اقدار کے ساتھ ساتھ سماجی زندگی کے خدوخال نمایاں ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے ہاں نسائی طرز احساس بھی موجود ہے۔ فاطمہ حسن نے اپنی شاعری میں روایتی علامتوں اور تلازموں کو ایک نئے انداز میں استعمال کرتی ہیں۔ ان کی شاعری میں تصور محبت مکمل اور بھرپور ہے جس کی کئی کیفیات و تجربات ان کی شاعری میں موجود ہیں۔ ان کا ہاں ماضی کا رویہ دیگر شاعرات کے برعکس بھرپور ہے کیونکہ انہیں سقوط ڈھاکہ کے وقت پاکستان ہجرت کرنے کیلیے بہت سی مشکلیں برداشت کرنی پڑی۔ فاطمہ حسن کے باطنی جذبات و کیفیات کے ساتھ سماجی و معاشرتی مسائل موجود ہیں۔ غلام حسین ساجد رقمطراز ہیں:

"فاطمہ حسن نے معاشرتی زندگی کی ناہمواریوں کو یکبارگی بلڈوز کرنے کی بجائے، انہیں سلیقے سے ہموار کرنے کی سعی کی ہے وہ محبت، معصومیت اور حسن پر یقین بھی رکھتی ہے اور یہ شعور بھی کہ ماحول کی بدنظمی اور کج روی کو راہ راست پر لانے کے لیے ان تینوں کا تال میل بھی ضروری ہے اور فروغ بھی۔ اس کی شاعری، اس فریضے کی انجام دہی پر کاربند ہے اور اسے یقین ہے کہ وہ موجود کی بدصورتی کو اپنے خوبصورت لفظوں کی نقش جمیل سے ڈھانپ دے گی"۔ (۳۶)

فاطمہ حسن کے ہاں نسائی فکر و شعور ملتا ہے۔ وہ ایک سر گرم فیمینسٹ شاعرہ ہیں جبکہ ان کی شاعری میں سیاسی جبر و تشدد کا رویہ بھی نظر آتا ہے کہ کس طرح انسانی اقدار کی پامالی ہو رہی ہے۔ وہ ارد گرد کے ماحول اور اس میں پھیلی ہوئی بے چینی کو شدت سے محسوس کرتی ہیں۔

فاطمہ حسن کی شاعری میں ان کی منظر کشی کو ان امتیازی کی خصوصیت قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ ان کے ہاں منظر کشی باقی شاعرات کی نسبت زیادہ نمایاں ہے۔ حمیدہ شاہین اور فاطمہ حسن کی شاعری میں یکساں طور پر نسائی فکر اور شعور نظر آتا ہے اسی طرح ان دونوں کے ہاں محبت، معاشرتی اقدار اور سماجی مسائل جیسے موضوعات قدر مشترک ہیں لیکن فاطمہ حسن کی شاعری ماضی کا رویہ بھرپور ہے۔ فاطمہ حسن اور حمیدہ شاہین کے ہاں سیاسی جبر کا رویہ نمایاں ہے۔

۱۲۔ شاہدہ حسن ۲۴ نومبر ۱۹۵۳ء:۔

شاہدہ حسن ۲۴ نومبر ۱۹۵۳ء میں چٹاگانگ (مشرقی پاکستان) میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے بی اے آنرز ایم اے انگریزی کراچی یونیورسٹی سے ۱۹۷۵ء میں کیا۔ اس کے بعد درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ ہو گئی ان کے مجموعہ کلام "ایک تارا ہے سرہانے میرے" اور "یہاں کچھ پھول رکھے ہیں" کے نام سے منظر عام پر آئے۔ انہوں نے غزل، نظم اور نثری نظم میں طبع آزمائی کی۔ شاہدہ حسن کے بارے میں محمد خالد لکھتے ہیں۔ "نئی شاعری کی رو میں جگہ بنانے والی شاعرات میں شاہدہ حسن واحد شاعرہ ہیں جنہوں نے شاعری کو نسائی جذبوں کے اظہار اور نام و نابود کا وسیلہ بنانے سے زیادہ اپنی ذات کے مکاشفہ کے لیے برتنے کی سعی کی ہے"۔(۳۷) شاہدہ حسن کی شاعری میں محبت تانیثی طرز اظہار کے طور پر سامنے آئی ہے ان کے ہاں محبت کے تجربے کے اظہار میں نسائی شعور اور نسائی لہجہ نمایاں ہے۔ ریاض صدیقی رقمطراز ہیں:

> "کرب ہجرت سے لے کر زندگی کرنے کی جدوجہد کی مختلف چھوٹے بڑے دکھوں تک جن میں انسانوں کے دکھ درد کی حالتیں بھی شامل ہیں۔ شاعرہ نے مزاریت، ٹوٹ پھوٹ اور اعصابی بحران یا سائیر و فیرینک حالت سے خود کو بچائے رکھا ہے۔ اس قسم کے منفی اعصابیت بیگانگی کا احساس اور پہچان کے بحران کا واویلا ساٹھ کی دہائی کے بعد جدیدیت پسند اردو شاعروں نے اور کہانی کاروں کے یہاں چھا گیا۔۔۔۔ شاہدہ کے ہاں یہ نمایاں رجحان حاوی نہیں ہوا نہ وہ جدیدیت پسندوں کی طرح سمٹ سمٹا کر، اپنی ذات کی تسخیر میں جت گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی یاسیت میں رجائیت اور امکانات

پر اعتبار کی توانائی ہے اس لیے شکست وناکامی کے باوجود وہ خواب دیکھنے اور بننے سے دستبردار نہیں ہوئیں کیوں کہ خواب کی تعبیر تک پہنچ اور کو حقیقت بنانے کے امکانات توہر لمحہ موجود رہتے ہیں"۔(۳۸)

شاہدہ حسن کی غزلوں میں تازہ ہجرتوں کے زخم اور کرب ہجرت سے بوجھل دکھوں کی بہت سی پرچھائیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے ہاں ترک وطن کا دکھ اور اس کے باعث ملنے والی بے گھری اور بے مہری کی واضح جھلک دکھائی دیتی ہے لیکن ان کے ہاں بغاوت تلخی بن کر ابھرنے کی بجائے نرم احتجاج تنقید اور تبصرے کی صورت میں نظر آتی ہے جو انہیں دیگر شاعروں سے ممتاز کرتی ہے۔ شاہدہ حسن کی شاعری میں شخصی رومان ، درد ملال ، تنہائی، مایوسی الجھنیں ، خواب ، یادیں ، ہجرت اور حب الوطنی جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ ان کی غزلوں کے اسلوب میں نئے شعری مزاج کے ساتھ عصری شعور اور کلاسیکی روایات کا نہایت خوبصورت امتزاج نظر آتا ہے۔ محمد خالد لکھتے ہیں۔

"شاہدہ حسن نے اپنی شاعری کو کسی نسوانی جذبے کی تخصیص کئے بغیر، بے تکلف اپنائیت اور بے غرض مسرت میں رچے بسے منظروں اور مظاہر کی ایک معصوم فضا میں اپنے متوازن رسیلے اور پر وقار لہجے کے سبب اس ہنر مندی سے پروان چڑھایا ہے جو دلکشی میں اپنی مثال آپ ہے اور آنے والے قافلوں کے لیے ایک نئی شعری طلسمات کا استعارہ۔"(۳۹)

حمیدہ شاہین اور شاہدہ حسن کے ہاں تانیثی طرز ہونے کے باوجود شاہدہ حسن کا نسائی شعور محبت کے تجربے کی صورت میں آیا ہے شاہدہ حسن کے ہاں ترک وطن کی وجہ سے ملنے والی بے گھری کی وجہ سے بے ثباتی نظر آتی ہے جبکہ حمیدہ شاہین کی نظموں اور غزلوں میں حب الوطنی کی نمایاں جھلک نظر آتی ہے۔ عصری شعور اور کلاسیکی روایت کا امتزاج دونوں شاعرات کے ہاں موجود ہے۔

۱۳۔ سارا شگفتہ ۱۹۵۶ء:۔

سارہ شگفتہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو گجرات میں پیدا ہوئیں جبکہ ۶ جون ۱۹۸۵ میں انتقال کر گئی ان کا مجموعہ کلام آنکھیں ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔ ان کی شاعری کے بارے میں غلام حسین ساجد لکھتے ہیں۔

"سارا شگفتہ ایک سچی شاعرہ تھی۔ اس کی شاعری معاشرے کی جعل سازی، دورخی اور مکاری کا پردہ بڑی سفاکی سے چاک کرتی ہیں۔ وہ اعتبار گزیدہ تھیں یہی وجہ ہے کہ اس

کا لہجہ تلخ ہے اور اس پر کہیں کہیں بے رحمی کا گہرا سایہ ہے ریاکاری کے تار و پود سے بنی ہوئی اس دنیا کا پردہ چاک کرنے کو ایسے ہی شاعری کی جانی چاہیے تھی جیسی سارا شگفتہ نے کی اور ایسی ہی شاعرہ کی ضرورت تھی جیسی کہ وہ تھی۔(۴۰)

حمیدہ شاہین اور سارہ شگفتہ کی شاعری میں سماجی حوالے سے موضوعات قدر مشترک ہیں۔ سارہ شگفتہ کے ہاں سماجی موضوعات نفسیات اور جنسی حوالے سے نظر آتے ہیں جبکہ حمیدہ شاہین کے ہاں یہ نہیں ہے۔ ان کے ہاں جو نفسیات نظر آتی ہیں، وہ معاشرت میں یعنی سماجی حوالے سے نمایاں ہے۔

۱۴۔ماہ طلعت زاہدی ۱۹۵۶ء:۔

ماہ طلعت زاہدہ ۱۹۵۶ء میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے ایم اے اردو کیا اور اس کے بعد تدریس کے شعبہ سے وابستہ ہو گئیں۔ ان کے مجموعہ کلام "روپ ہزار "۲۰۰۲ء، "شاخ غزل ۲۰۰۶"ء۔"میں کیسے مسکراتی ہوں" ۲۰۱۲ء اور "تین مصرعوں کا جہاں" ۲۰۱۲ء کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ انہوں نے غزل اور نظم دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے ہاں نئے افکار اور خیالات کے متنوع موضوعات موجود ہیں۔ ماہ طلعت زاہدی اردو کی جدید شاعرات میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ ان کے ہاں ناکامی، مایوسی، اور بے عملی کے خلاف واضح رد عمل نظر آتا ہے۔ وہ ناکامی اور مایوسی کو تسلیم کرنے کی بجائے اس کے خلاف رد عمل ظاہر کرتی ہے۔ ان کا یہی رویہ ان کی مضبوط رجائی فکر کی دلیل ہے جبکہ ان کے ہاں زندگی سے محبت کا رویہ سب سے نمایاں ہے۔ ماہ طلعت زاہدی کے ہاں رومانوی جذبے اور احساس کی کارفرمائیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ ماہ طلعت زاہدی کے ہاں دکھ اور الم موجود ہونے کے باوجود ان کے ہاں زندگی کی تلخیوں سے پسپائی کا رویہ نظر نہیں آتا۔

ماہ طلعت زاہدی حقیقت پسند اور حقیقت شناس شاعرہ ہیں۔ ان کی شاعری میں نئی دنیا کے نئے انسان اور نئے حالات کس طرح بدلتے ہیں ان کے بارے میں گہرا شعور ملتا ہے۔ ماہ طلعت زاہدی حقیقت پسند ہونے کے ساتھ رجائی لہجے کی حامل شاعرہ ہیں۔ ان کی شاعری میں ہمارے مختلف سماجی مسائل اور المیوں کا اظہار ملتا ہے۔ سماج میں ایک طرف غربت و افلاس کی شکار عوام ہے جبکہ دوسری طرف سرمایہ دار اور حکمران طبقہ ہے اور یہ سماجی ڈھانچہ معاشی اور طبقاتی تفاوت کی دلیل ہے۔ ماہ طلعت زاہدی اپنے ارگرد میں موجود زندگی پر چھائی موت، وحشت، بھوک و افلاس اور زندگی کے کئی منفی عوامل کو دیکھ کر بھی محبت کے بے شمار خواب جوڑے رکھتی ہے۔

ڈاکٹر اسد اریب لکھتے ہیں۔

> ماہ طلعت نے اپنی نظموں میں علامت اور استعارے کو ایک کامیاب خوبصورتی اور نمایاں انفرادیت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ علامت اور استعارہ تخلیق کے پر کیف اور شباب آور لمحوں کی شناخت ہے جہاں تخلیقی قوتوں کا زور ہو گا وہاں علامتیں زیادہ سے زیادہ وسیع المعانی کشادہ اور رومان انگیز ہوں گی اس دور کے وحشت انگیز استعاروں اور ہلاکت خیز علامتوں نے ادب کے قاری پر ایک لرزہ سا طاری کر رکھا ہے۔ ماہ طلعت کے یہاں ایذا رسانی کا ایسا کوئی عمل نہیں۔ اس کے استعارے روشن خوش آہنگ اور کشادہ ہیں۔ ان معلوم و محسوس علامتوں کے ذریعے ہم معنی کا سفر نہایت آسانی سے طے کر سکتے ہیں۔[۴۱]

حمیدہ شاہین اور ماہ طلعت دونوں شاعرات کے ہاں سماجیات کا رویہ یکساں ہے لیکن دونوں کا مزاج الگ الگ ہے۔ حمیدہ شاہین کی نظموں میں مذہبی رویہ زیادہ ہے جبکہ ماہ طلعت زاہدی کے ہاں سماجی رویہ ہے۔

۱۵۔ عشرت آفرین ۱۹۵۷ء:۔

عشرت آفرین ۲۵ دسمبر ۱۹۵۷ء میں اتر دلہ (اتر پردیش بھارت) میں پیدا ہوئی۔ عشرت آفرین عہد حاضر کی نظم گو اور غزل گو شاعرہ ہیں۔ ان کے مجموعے "کنج پیلے پھولوں کا" ۱۹۸۵ء اور "دھوپ اپنے حصے کی" ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئے۔ ان کا اسلوب اپنے اندر انفرادیت سموئے ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری میں ہمیں ہندوستان اور پاکستان کی دیہی اور شہری زندگی کی فضا نظر آتی ہے جس میں انہوں نے چھوٹے چھوٹے قصبوں سے لے کر بڑے بڑے شہروں کے باسیوں، ان کے طرز زندگی ان کی خوشیوں کے لمحات اور دکھوں کو اپنے موضوعات کا حصہ بنایا ہے۔ عشرت آفرین ان شاعرات میں سے ایک ہیں جنہوں نے عورتوں کے حوالے سے اپنی آواز بلند کی۔ ان کے اظہار میں ہمہ پن ہونے کے باوجود ان کی جرات، حوصلہ مندی اور لہجے کی قطعیت ان کی شاعری کی خاصیت ہے۔ افتخار عارف لکھتے ہیں:

> عشرت آفرین ایک مکمل شاعرہ کے امکانات لیے ایوانِ ادب میں آئی تھیں اور اپنے تخلیقی جوہر اور ایک مخصوص تہذیبی لب و لہجہ کے سبب دنیا بھر کے معتبر و مستند صاحبان نقد و نظر سے داد و تحسین وصول کرنے میں کامیاب ہوئی تھیں۔ ذمہ دار اور مسوّل کا شاعرہ کا سفر شعر ارتقاء کی جن منزلوں کی طرف بڑھ رہا ہے وہ قابل رشک

حد تک حیرت انگیز ہے۔ رومان کی دل آویز فضاوں سے نکل کر عشرت کے دنیائے ہنروری میں آپ زندگی کی ہزار شیوہ جہتوں کو جمالیاتی سطح پر نمود کرتے دیکھتے ہیں تو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہمیں ایک بے پناہ تخلیقی جوہر سے مزین اور مختلف اسالیب کو آمیز کر کے اپنے لیے نئی راہ نکالنے والی ایک بڑی شاعرہ سے ہم کلامی کی نعمت میسر آرہی ہے۔ (۴۲)

عشرت آفرین کی شاعری میں ایسے موضوعات نظر آتے ہیں جن کا ذکر کرنے سے دوسرے شعراء پہلو تہی کرتے ہیں۔ ان کے یہاں عصر حاضر کے شعور کی واضح جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ان کے ہاں وطن سے، اپنی مٹی سے سرزمین اور اس کے بدحال لوگوں کے دکھ سکھ اور ان سے محبت کے پہلو نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں انسانیت کے دکھوں سے لبریز موضوعات موجود ہیں۔ ان کی شاعری کے بارے میں احمد ندیم قاسمی رقمطراز ہیں:

عشرت نے نظم اور غزل کہنے کا ایک ایسا انداز وضع کر لیا ہے جو اردو شاعری کی تین صدیوں کے حوالے سے عشرت ہی کی دین ہے بلکہ ان کی پہچان ہے۔ اکیسویں صدی خوش نصیب ہے کہ اس کا آغاز عشرت آفریں کی رسیلی اور سیدھی دل میں اتر جانے والی اور سچی کھری شاعری سے ہو رہا ہے۔ (۴۳)

جبکہ سحر انصاری لکھتے ہیں:

موضوعات، ذاتی جذبات و محسوسات کے ساتھ ان کی شاعری میں ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ وہ زندگی کی عام زبان کو شاعرانہ بنانے کا سلیقہ جانتی ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔ میں عشرت آفرین کو داد دیتا ہوں کہ انہوں نے "نسائیت" کے زاویے سے اپنی نظم کو ایک نیا تناظر دے دیا ہے۔ عشرت آفرین شاعرانہ اظہار کے سفر میں آگے بڑھ رہی ہیں۔ ان کا کلام جدید اردو شاعری میں اپنا ایک مختلف رنگ رکھتا ہے۔ جدید اردو شاعری کا کوئی بھی سنجیدہ نقاد یا قاری عشرت آفریں کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ (۴۴)

حمیدہ شاہین اور عشرت آفرین میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ عشرت آفرین کے یہاں دیہی اور شہری زندگی سے جڑے موضوعات ملتے ہیں جبکہ حمیدہ شاہین کے ہاں نہیں ہیں ۔ عورت کے حق میں دونوں شاعرات نے آواز بلند کی ہے لیکن عشرت آفرین نے لہجہ دھیما ہونے کے باوجود جرات کا مظاہرہ کیا جبکہ حمیدہ شاہین کا لہجہ نرم اور دھیما ہونے کے باوجود کاٹ دار لہجہ ہے۔ عصری شعور حمیدہ شاہین اور عشرت آفرین کے موضوعات میں یکساں ہے۔

۱۶۔ ثمینہ راجہ ۲۰۱۲ء- ۱۹۵۸ ء:۔

ثمینہ راجہ ۱۱ ستمبر ۱۹۵۸ کو راجہ کوٹ رحیم یار خان میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے غزل اور نظم دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی ہے جبکہ وہ معاصر اردو غزل میں اپنے منفرد لب ولہجہ کی وجہ سے اپنی ایک الگ پہچان رکھتی ہیں۔ ان کے مجموعہ کلام میں "باغ شب"، "بازید"، "ہفت آسماں"، "پری خانہ"، "عدن کے راستے پر"، "دل لیلیٰ"، "عشق آباد"، "ہجر سرا"، "سیمیا"، "ایمیا" اور "کتاب خواب" شامل ہیں۔ ثمینہ راجہ نے اپنے موضوعات اور انداز بیاں کی بدولت شاعرات کی صف میں بہت جلد اپنی انفرادیت قائم کی جبکہ ان کی غزل کا اچھوتا پن ثمینہ راجہ کو ان کی ہم عصر شعراء سے ممتاز کرتا ہے۔ جدید عہد کے تمام المیے ان کی شاعری کے موضوعات میں موجود ہیں۔ احمد ندیم قاسمی رقمطراز ہیں۔

> "ثمینہ راجہ نظم اور غزل دونوں یکساں مہارت سے کہتی ہیں اور انہوں نے بہت کم عمری میں ان دونوں اصناف سخن پر حیرت انگیز پر قدرت حاصل کرلی۔ مجھے ان کی شاعری میں اس وقت بھی ایک بڑی شاعری کے امکانات واضح طور پر نظر آتے تھے چنانچہ میں نے ہمیشہ انہیں ایک گہری مسرت کے احساس کے ساتھ فنون میں چھاپا"۔[۴۵]

ثمینہ راجہ نے اپنے عہد کی بے حسی، نسوانی مسائل اور معاملات کے علاوہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو اپنی غزل کے موضوعات میں سمویا ہے۔ ان کی نظمیں "بمباری کے بعد" اور "مرگ بر امریکہ" وغیرہ اس عہد کی بے حسی کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ان کی غزلوں میں ہمیشہ ہمیں تاریخی شعور بھی نظر آتا ہے۔ اسی طرح ان کی شاعری میں معاشرتی، معاشی وسیاسی انتشار کے ساتھ تہذیبی شکست کے اہم موضوعات نمایاں ہیں۔

ثمینہ راجہ کے ہاں محبت کا موضوع بنیادی موضوع کے طور پر سامنے آتا ہے۔ زندگی کے پر خار اور کھٹن راستوں میں محبت ہی انہیں زندگی کی اولین سچائی نظر آتی ہے۔ ثمینہ راجہ کی شاعری کے حوالے سے احمد فراز لکھتے ہیں۔

> "ثمینہ راجہ اس وقت شاعری کی اس منزل پر ہے جہاں مدتوں کی صحرانوردی کے بعد آدمی پہنچتا ہے۔ وہ نظم اور غزل دونوں میں اتنی خوبصورت شاعری کررہی ہیں کہ آج انگلیوں پر گنے جانے والے گنتی کے شاعروں ان کا شمار ہوتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔شاعری بہت مشکل چیز بھی ہے اور آسان بھی۔ آسان اس لیے کہ بے شمار شاعر ہر طرف آپ

کو نظر آئیں گے مگر مشکل اس وقت ہو جاتی ہے جب اتنی بڑی تعداد میں لکھنے والی مخلوق موجود ہو اور اس میں اپنا ایک تشخص اور قد و قامت قائم کیا جائے اور اس میں ثمینہ راجہ کو نہ صرف کامیابی ہوئی ہے بلکہ وہ ان سے آگے نظر آتی ہیں"۔[۴۶]

ثمینہ راجہ کی شاعری میں ان کی ذات اور وجود کا حوالہ مرکزی ہے ان کے ہاں دوری کے خیال سے خوف نظر آتا ہے وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ سامنے رہ کر مقدر میں نارسائی ہے لیکن وہ پھر بھی نظروں سے دوری برداشت نہیں کرنا چاہتی۔ ثمینہ راجہ نے اپنے دکھ کرب، تنہائی، اداسی، اور محرومی میں اپنے قارئین کو شریک کرتی ہیں۔ ان کے ہاں حقیقت پسندانہ فکر کا عمل دکھائی دیتا ہے انہوں نے جدید نظم کی مختلف ہیتوں کا تجربہ کیا ہے۔ انہوں نے پابند نظم، معری، نثری نظم میں جدید اسلوب کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر رقمطراز ہیں:

"ثمینہ راجہ نے غزل کو نہ صرف وسیلہ اظہار بنایا ہے بلکہ اس کی روایتی حیثیت کو بھی بحال رکھا ہے اور اس کی توقیر میں اضافہ بھی کیا ہے لیکن نظم کے ساتھ بھی ثمینہ راجہ کی والہانہ وابستگی اس کے مزاج کے ساتھ گہری مطابقت رکھتی ہے۔ اس کی نظم میں جذباتی حسیت کے ساتھ ساتھ فکری ادرک بھی واکرتی ہے یہاں تک کہ اس کی نظم ایک مقام پر آکر غزل سے الگ راستے پر چلنے لگتی ہے۔[۴۷]

ثمینہ راجہ کی شاعری میں باطنی تجربات اور کیفیات دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی تمام شاعری کا بنیادی موضوع اظہار ذات ہے۔ ان کے یہاں ہجر و فراق کی کیفیت کے علاوہ نارسائیوں کا دکھ اور لاحاصلی کا کرب نمایاں ہے۔

حمیدہ شاہین اور ثمینہ راجہ کے ہاں اپنے اپنے عہد کے مسائل اور نسوانی معاملات یکساں ہیں۔ ثمینہ راجہ کے ہاں تاریخی شعور جبکہ حمیدہ شاہین کی ہاں سماجی شعور نظر آتا ہے۔ ثمینہ راجہ کے ہاں ماضی پرستی، خواہشات، تنہائی کے ساتھ ساتھ دیومالائی موضوعات ہیں جبکہ حمیدہ شاہین کی شاعری میں اخلاقی، قومی، سماجی اور محبت کے موضوعات ملتے ہیں۔ ثمینہ راجہ نے پابند نظم، معری اور نثری نظم میں اسلوب لکھا ہے جبکہ حمیدہ شاہین کے ہاں آزاد نظم ملتی ہے۔ ثمینہ راجہ کے ہاں اظہار ذات، ہجر اور تنہائی نمایاں ہیں جبکہ حمیدہ شاہین کے ہاں نسائی زاویہ مرکزی ہے۔

۱۷۔ منصورہ احمد:(۱۹۵۸ء- ۲۰۱۱ء):۔

منصورہ احمد یکم جون ۱۹۵۸ء کو ضلع حافظ آباد میں پیدا ہوئیں۔ منصورہ احمد کا پہلا شعری مجموعہ "طلوع " کے نام سے شائع ہوا۔ منصورہ احمد کے ہاں جدید عہد کے رجحانات اور عصری شعور کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ ان کے مجموعہ کلام "طلوع" میں سماجی ناانصافیوں اور ناہمواریوں کی داستان سنائی دیتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے "صنف نازک کی شاعری" میں لکھا ہے:

> "منصورہ احمد نے اُردو میں مرد شاعروں اور خاتون شاعرات کی تفریق ختم کر ڈالی ہے۔ خاتون ہونے کی وجہ سے یقیناً اس کے فن میں وہ نرم روی اور نرم گفتاری موجود ہے جو مشرق کی خواتین کا مزاج و کردار ہے مگر اس کی شاعری نے معاشرے کے ایک باوقار اور خود آگاہ فرد کی حیثیت میں صرف عورت یا صرف مرد کے لہجے میں نہیں بلکہ ایک نہایت درجہ حساس انسان کے لہجے میں بات کی ہے منصورہ احمد بیسویں صدی کی آخری دہے کی وہ شاعرہ ہے جس کا لہجہ منفرد اور جس کا لحن مستقبل گیر ہے"۔[۴۸]

منصورہ احمد کی نظموں میں درد کی ہلکی ہلکی کسک اور عصری شعور کی واضح جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ان کے یہاں "رات" کا استعارہ کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ رات کو وہ عصری انتشار کی علامت کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔ اسی طرح ان کے ہاں حکام بالا کے بارے میں شدید طنز نظر آتا ہے وہ غلاموں کی طرح سر جھکا کر حکام بالا کے سامنے کھڑے ہونے پر طنز کرتی ہیں۔ منصورہ احمد مثبت فکر کی حامل ہیں۔ ان کی شاعری میں انسانی زندگی کا پورا منظر نامہ دکھائی دیتا ہے۔ منصورہ احمد نے ملکی سیاست سے لے کر بین الاقوامی استحصالی، ہتھکنڈوں اور سماج کے عام فرد سے لے کر اپنی ذات تک کے تمام موضوعات اپنی شاعری میں سمو دیئے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "منصورہ احمد کے سفر شاعری کا ایک اور منفرد رخ یہ ہے کہ اس نے اپنے فن کو صرف حسن و عشق، صرف سیاست و انقلاب، صرف فلسفہ و نفسیات کے کسی ایک خانے میں محدود نہیں کر لیا بلکہ اس کے ہاں زندگی کے سب مظاہر ایک حیرت انگیز حد تک خوب صورت امتزاج کے ساتھ فن میں جذب ہوتے چلے گئے ہیں۔ زندگی سے اس کا بہت سچا رشتہ ہے یہی وجہ ہے کہ موضوعات کا اتنا وسیع تنوع بڑے بڑے اردو شعراء میں بھی بہت کم دستیاب ہے۔ موضوعات کے معاملے میں منصورہ احمد کی شاعری کا پیتوراما افق تا

افق پھیلتا محسوس ہوتا ہے۔ گہری انسانی نفسیات، معاشرت، سیاست، تہذیب و تاریخ۔۔۔ غرض انسانی زندگی کی بو قلمونی سے منصورہ کی شاعری لبریز ہے۔ اس کی شاعری پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ زندگی کھیتوں، گلیوں، شاہراہوں، گھروندوں، ایوانوں اور ذہنوں سے نکل کر ان کی سطروں میں دھڑکنے لگتی ہے"۔[۴۹]

منصورہ احمد کے ہاں سماجیات سے متعلق موضوعات موجود ہیں۔ ان کی شاعری میں سماجی زندگی کی تلخیاں نظر آتی ہیں۔ منصورہ احمد سماجی بے حسی اور عدم شناخت کو خزاں کا موسم قرار دیتی ہیں کیونکہ انہیں انسانوں کا دوغلا پن شدید اذیت دیتا ہے اسی طرح ان کی نظم " مجھے رستہ نہیں ملتا" میں انہوں نے طبقاتی معاشرے پر شدید طنز کیا ہے۔ ان کا سماجی شعور ان کو معاشی غیر مساویت پر شدید احتجاج کرنے کے لیے مجبور کرتا ہے اسی طرح ان کی نظم "سیاست" سیاسی نظام پر شدید چوٹ ہے۔ منصورہ احمد کے یہاں نسائی فکر و شعور کی واضح جھلک دکھائی دیتی ہے ان کی شاعری میں محبت جیسے جذبے کا خوب صورت اظہار ملتا ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں باپ اور بیٹی کے گہرے اور خوبصورت تعلق کی تصویریں پیش کی ہیں۔ منصورہ احمد گرد و پیش کے نامساعد حالات کے باوجود جینے کی امید نہیں چھوڑتی بلکہ برقرار رکھتی ہیں۔

حمیدہ شاہین اور منصورہ احمد کے ہاں عصری شعور اور سماجی ناانصافیوں کے متعلق موضوعات یکساں ملتے ہیں۔ منصورہ احمد کے ہاں عصری انتشار کے علاوہ بین الاقوامی استحصالی کے موضوعات بھی ہیں۔ حمیدہ شاہین نے ذریعہ اظہار کے لیے غزل کو چنا جبکہ منصورہ احمد نے نظم کے راستے کو اپنایا۔ حمیدہ شاہین اور منصورہ احمد کے ہاں سماجی شعور اور نسائی فکر یکساں ہے۔

۱۸۔ نوشی گیلانی: (۱۴ مارچ ۱۹۶۴ء):۔

نوشی گیلانی کا اصل نام نشاط مسعود جبکہ قلمی نام نوشی گیلانی ہے۔ نوشی گیلانی ۱۴ مارچ ۱۹۶۴ء کو پیدا ہوئیں۔ ان کے مجموعے کلام " محبتیں جب شمار کرنا"، "اداس ہونے کے دن نہیں ہیں" اور " ہم تیرا انتظار کرتے رہے" کے نام سے شائع ہوئے۔ ان کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر طاہر تونسوی رقمطراز ہیں:

"نوشی گیلانی لمحۂ موجود کی ایک ایسی ذہین شاعرہ ہیں جس نے روحِ عصر کے تمام تر امکانی موضوعات کا منفرد لب و لہجے اور چونکا دینے والے اور پھر دل میں کھب جانے والے تازہ اور نویلے اسلوب کے ساتھ شعری منظر نامہ تشکیل دیا ہے۔ اس نے اجلے اور دھندلے موسموں میں ایسی مہتاب رتیں ترتیب دی ہیں جن کی بناء پر اس کے ہاں عذاب فن حسن تخلیق بن گیا ہے۔ اس کی سوچ دریچوں سے اظہار کی جو صدائیں تلاطم کا باعث بنی ہیں۔ اس کی وجہ سے میں اسے لفظوں کو آوازیں عطا کرنی والی شاعرہ کہتا ہوں۔"[۵۰]

نوشی گیلانی کے ہاں تمام موضوعات محبت کے نظر آتے ہیں۔ پروین شاکر کے بعد نوشی گیلانی نے بھی اپنی شاعری میں نسائی لہجے اور نسائی آہنگ کو اپناتے ہوئے رومانوی جذبات کو موضوع بنایا۔ نوشی گیلانی کے یہاں غم، ملال، شکست اور تنہائی کے مقابلے میں امید اور خوشی کا احساس کم ہے۔ احمد ندیم قاسمی نوشی گیلانی کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> " یہ نوشی کے ہاں شہر اور شہر والوں کی تکرار ہے تو یہ دراصل اس کی آب بیتی کی وہ قاشیں ہیں جنہیں چھونے کی کوشش کریں تو انگلیوں کی پوریں خون سے بھیگ جائیں۔ یہ خون ایک نہایت درجہ حساس اور باکردار لڑکی کی اس انا کا خون ہے جس میں سے اس کے شہر والوں کے بعض کوتاہ بینو نے اپنی نجی مصیبتوں کے تحت اندھا دھنگ سنگ باری کی اور تہذیب و ثقافت کے مستقبل کی اس امانت دار کو لہولہان کر دیا۔ اسی لئے تو وہ اس شہر کو شہر تمہت لکھتی ہے اور خدا سے التجا کرتی ہے کہ وہ اسے اس تہمت گاہ سے رہائی دلائے جس میں اس کا اثاثہ اس کے فرد عمل کا آئینہ ہے۔ اس کے جذبوں، آنکھوں اور سچائیوں کا آئینہ ہے۔ اس کی صبحوں اور شاموں میں اس کے سوچے ہوئے لفظوں کا آئینہ ہے اور ان نعمتوں کا آئینہ ہے جو محبوب خدا کی یاد میں اس کے اشکوں کی صداقتوں میں لکھی گئیں۔ (۵۱)

نوشی گیلانی کی شاعری میں داخلی جذبات کی عکاسی کے علاوہ معاشرتی، سیاسی و سماجی زندگی کی تلخ سچائیاں نظر آتی ہیں۔ نوشی گیلانی کی شاعری میں دکھ، ہجرتوں کے زخم، نادید منزلوں کا خوف اور تنہائی کے موضوعات موجود ہیں۔ نوشی گیلانی کی نظموں اور غزلوں میں رائیگانی اور رسائی اور رومانوی فکر کا اظہار ملتا ہے۔ ان کے اسلوب میں اظہار کا خوب صورت سلیقہ نظر آتا ہے۔ ان کے لہجے کے ساتھ الفاظ کا انتخاب، مخصوص الفاظ، تلازمے اور علامتیں ان کے وژن کی عکاسی کرتے ہیں۔ نوشی کی شاعری میں ان کے مزاج کی نفاست، دھیما پن اور انسانیت انہیں احتجاج کرنے کی بجائے رومانوی انداز اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

نوشی گیلانی کا رویہ خالصتاً رومانوی ہے، محبت ان کا اہم موضوع ہے۔ ان کی شاعری میں سماجی زندگی کی تلخیاں ہیں لیکن حمیدہ شاہین کے ہاں سماجی زندگی کی تلخیاں زیادہ واضح اور بھرپور ہیں۔ نوشی گیلانی کے ہاں نسائی لہجہ رومانوی انداز میں سامنے آتا ہے جبکہ حمیدہ شاہین کے ہاں نسائی وجود کی آگہی اور پہچان کے حوالے سے موضوعات موجود ہیں۔

۱۹۔یاسمین حمید:۔

یاسمین حمید ۱۴مارچ ۱۹۵۱ء کو لاہور میں پیدا ہوئیں۔ایم۔ایس۔سی کرنے کے بعد شعبہ تدریس سے وابستہ ہو گئیں۔ان کے مجموعہ کلام "فنا بھی ایک سراب"(۲۰۰۱ء)،"آدھا دن اور آدھی رات"(۱۹۹۶ء)، حصار بت درو دیوار" (۱۹۹۱ء)، پس آئینہ (۱۹۸۸ء) اور "دوسری زندگی"(۲۰۰۷ء) کے نام سے شائع ہوئے۔ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> "اعلیٰ تعلیم یافتہ اور فنون لطیفہ کی شائق "یاسمین حمید" اگرچہ ایسی آسودہ اور مطمئن خاتون خانہ ہیں جس کا محور زیست خوش ذوقی سے آراستہ گھر، شوہر اور بچے ہیں تاہم یاسمین نے اپنے لیے الگ جہاں تخلیق بھی آباد کر رکھا ہے۔یہ تصورات اور محسوسات کی دنیا ہے شائستہ لہجے میں ہم کلام ہونے والی یاسمین حمید بحیثیت یاسمین کیا محسوس کرتی ہے جب اس کا اظہار تخلیقی سطح پر ہوا تو شعر نے جنم لیا۔شاعرہ نے شخصیت کے نہاں خانے میں تخلیق سفر کی منزلیں سر کیں تو سائیکی کے لینڈ سکیپ سے تخلیق کے پھول حاصل کیے۔ایسے پھول جن کی مہک میں نئے پن کی دلنوازی ہے۔وہ تخلیق کے ذریعے مقطع میں تعلی یا خود نمائی نہ کرنے کے باوجود بھی شعر کو ذات کا استعارہ بنا دیتی ہے"۔(۵۲)

یاسمین حمید عصر حاضر کی شاعرات میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہیں۔انہوں نے غزل و نظم دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔یاسمین حمید کے ہاں روایت اور جدیدیت کا امتزاج نمایاں ہے۔ان کی شاعری میں بیان کی شگفتگی اور فنی پختگی کا احساس نمایاں ہے۔یاسمین حمید اپنے مشاہدات اور جذبات کا اظہار فکری گہرائی سے کرتی ہیں۔یاسمین حمید کی آواز شعری حسن کاری، فکری توانائی اور احساسات کی شادابی دیگر شاعرات میں ان کو نمایاں کرتی ہے۔یاسمین حمید کے تخیل کا انداز مختلف اور اظہار منفرد ہے۔ڈاکٹر سلطانہ بخش رقمطراز ہیں۔

> "ان کا تخلیقی تجربہ صرف مجرد فکری مسائل سے عبارت نہیں بلکہ جہاں کہیں موقع ملا انہوں نے سلیقے کے ساتھ کائنات کو عورت کی آنکھ دے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔روش عام سے ہٹ کر چلنا ان کی غزل کا خاص وصف دکھائی دیتا ہے"۔(۵۳)

یاسمین حمید کے لہجے میں انفرادیت نظر آتی ہے ان کے یہاں عورت اس کائنات کے عام انسان کی حیثیت سے نظر آتی ہیں۔ یاسمین حمید کے ہاں دیگر شعراء کی طرح سورج، چاند، ستارے، صحرا اور پانی جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ ان کی شاعری میں متنوع ہیں۔ ان کی شاعری میں تنہائی، محرومیوں اور گریز پا کامرانیوں کے موضوعات بھی ملتے ہیں۔ یاسمین حمید کی شاعری میں تانیثی جہت کی جھلک نظر آتی ہے۔ شمس الرحمن فاروقی یاسمین حمید کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> "اس کی شاعری پر 'عورت پن' کا خود کار ٹھپہ نہیں ہے۔ وہ عورت بھی اور دکھ اٹھاتے ہوئے امید و بیم سے لڑتے ہوئے خوف اور دہشت اور عالم گیر تاجرانہ سماج کے دباؤ میں جینے کی کوشش کرتے ہوئے جدید انسان کی بھی ترجمان ہے۔ (۵۴)

یاسمین حمید کی شاعری کی یہ انفرادیت ہے کہ ان کی شاعری میں عورت عام انسان کے طور پر سامنے آئی ہے جبکہ حمیدہ شاہین اپنی شاعری میں عورت کی الگ حیثیت اور پہچان کا تقاضا کرتی ہیں۔

جن قابل ذکر شاعرات کی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے وہ سب تقریباً موجودہ عہد سے متعلقہ شاعرات ہیں۔ چنانچہ سب شاعرات ایک ہی تہذیب و ثقافت سے تعلق رکھتی ہیں لہذا ان سب کے موضوعات اور زیادہ تر مسائل ایک جیسے ہیں لیکن جب ان کے اسلوب اور تحریر کو دیکھا جاتا ہے تو ہمیں ان سب کی انفرادیت کا پتہ چلتا ہے ایک جیسے موضوعات رکھنے کے باوجود ان سب کے مزاج میں ہمیں واضح فرق نظر آتا ہے، ان کا الگ مزاج اور اسلوب ان کی انفرادیت ہے اسی طرح حمیدہ شاہین کا مزاج اور اسلوب دوسری شاعرات سے مختلف ہے جس کی وجہ سے انہوں نے اپنا ایک الگ مقام پایا اور اپنی انفرادیت قائم کی۔

حوالہ جات

۱۔ فیروز الدین، مولوی، مرتب، فیروز اللغات اردو، فیروز سنز لمیٹیڈ پرائیویٹ، لاہور، نیا ایڈیشن، ص ۱۲۳۵

۲۔ رفیع الدین ہاشمی، اصناف ادب، سنگ میل کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۴

۳۔ حمایت علی شاعر، صنف نازک کی شاعری، مرتبہ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۴

۴۔ خالدہ حسین، خواتین کی شاعری میں عورتوں کے مسائل کی تصویر کشی، وزرات ترقی خواتین، حکومت پاکستان، اسلام آباد ۲۰۰۵ء، ص ۲۲

۵۔ ادا جعفری، غزلاں تم تو واقف ہو، مکتبہ فنون، لاہور، ۱۹۷۴ء، ص ۸۴

۶۔ ایضا، ص ۹۵

۷۔ رشید امجد، ڈاکٹر، "پاکستانی ادبیات میں خواتین کا کردار" ترتیب و تدوین ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۱۰۴

۸۔ علی سردار جعفری، صنف نازک کی شاعری، مرتبہ طاہر نونسوی، ڈاکٹر الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص 32

۹۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پروین فنا کی شاعری، روزنامہ جنگ، اسلام آباد، (ادبی ایڈیشن)، ۱۲ ستمبر ۱۹۹۴ء

۱۰۔ زہرا نگاہ، ورق، (دیباچہ) احمد ندیم قاسمی، اساطیر، لاہور، ۱۹۹۸ء

۱۱۔ خالدہ حسین، زہرہ نگاہ، مشمولہ خواتین کی شاعری میں عورتوں کے مسائل کی تصویر کشی، وزرات ترقی خواتین، حکومت پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، ص ۸۷

۱۲۔ رشید امجد، ڈاکٹر "پاکستانی ادبیات میں خواتین کا کردار، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1994, ص ۱۰۲

۱۳۔ رشید امجد، ڈاکٹر، "پاکستانی ادبیات میں خواتین کا کردار، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1994، ص ۱۱۱

۱۴۔ غفور شاہ قاسم، "پاکستانی ادب میں شناخت کی نصف صدی، ریز پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۰۰، ص ۱۲۱

۱۵۔ کشور ناہید، گلیاں، دھوپ اور دروازے، مکتبہ عالیہ ایبک روڈ، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص ۱۴۱

۱۶۔ رشید امجد ڈاکٹر، "پاکستانی ادبیات میں خواتین کا کردار"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1994ء، ص ۱۲۲
۱۷۔ افتخار عارف (دیباچہ) "اضطراب"، شبنم شکیل، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء
۱۸۔ خالدہ حسین، "خواتین کی شاعری میں عورتوں کے مسائل کی تصویر کشی"، وزارت ترقی خواتین، حکومت پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، ص ۱۶۳، ۱۶۲
۱۹۔ ایضاً
۲۰۔ محمد امین، ڈاکٹر، "صنف نازک" کی شاعری، مرتبہ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۴۴
۲۱۔ خالدہ حسین، "خواتین کی شاعری میں عورتوں کے مسائل کی تصویر کشی (۲۰۰۲ء-۱۹۴۷ء)، وزارت ترقی خواتین حکومت پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، ص ۹۸
۲۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، میں مٹی کی مورت ہوں"، فہمیدہ ریاض، (دیباچہ) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء
۲۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، فلیپ، "میں مٹی کی مورت ہوں"، (کلیات فہمیدہ ریاض، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء
۲۴۔ سعادت سعید، ڈاکٹر، "صنف نازک کی شاعری، مرتبہ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، ص ۲۱۸
۲۵۔ ایضاً
۲۶۔ سعادت سعید، ڈاکٹر، شائستہ حبیب کی نظمیں، مشمولہ فن اور خالق، دستاویز مطبوعات، لاہور ۱۹۹۸ء، ص ۹۹
۲۷۔ غلام حسین ساجدہ، "صنف نازک کی شاعری"، مرتبہ تونسوی، ڈاکٹر، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۲۳۰
۲۸۔ ایضاً
۲۹۔ ایضاً

۳۰۔ محمد علی صدیقی، "صنف نازک کی شاعری، مرتبہ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۳۱

۳۱۔ غفور شاہ قاسم، پاکستانی ادب شناخت کی تصنیف صدی، ریزہ پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۰۰ء، ص ۱۲۱

۳۲۔ فتح محمد ملک، ڈاکٹر، چھوٹی حقیقتوں کی طرف سفر"، مشمولہ تحسین و تردید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۱۶۴

۳۳۔ محمد افسر ساجد، صنف نازک کی شاعری، مرتبہ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۳۲۲

۳۴۔ شاہین مفتی، مسافت، ص ۱۶۰ء، س، ن

۳۵۔ غلام حسین ساجد، صنف نازک کی شاعری، مرتبہ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۲۰۰

۳۶۔ ایضا، ص ۲۰۰

۳۷۔ ۔ محمد خالد، "صنف نازک کی شاعری"، مرتبہ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۸۸

۳۸۔ ریاض صدیقی، "اپنے عہد کی نوحہ گر" مشمولہ ماہنامہ، چہار سو، جلد نمبر ۱۱، شمارہ مئی / جون ۱۹۹۴ء، ص ۳۶

۳۹۔ محمد خالد، "صنف نازک کی شاعری" مرتبہ، طاہر تونسوی، ڈاکٹر، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۸۸

۴۰۔ غلام حسین ساجد، "صنف نازک کی شاعری"، مرتبہ، طاہر تونسوی، ڈاکٹر، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۴۴

۴۱۔ اسد اریب، ڈاکٹر، "صنف نازک کی شاعری"، مرتبہ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۳۸۶

۴۲۔ عشرت آفریں، افتخار عارف، دھوپ اپنے حصے کی"، شہر زاد، کراچی، ۲۰۰۵ء، فلیپ

۴۳۔ احمد ندیم قاسمی، عشرت آفرین، فلیپ، "دھوپ اپنے حصے کی"، شہر زاد، کراچی ۲۰۰۵ء

۴۴۔ سحر انصاری، عشرت آفرین، "دھوپ اپنے حصے کی"، کراچی شہر زاد، ۲۰۰۵ء، فلیپ

۴۵۔ احمد ندیم قاسمی، ثمینہ راجہ، "کتاب خواب" لاہور، خرینہ علم وادب، ۲۰۰۴ء، فلیپ
۴۶۔ احمد فراز، ثمینہ راجہ، کتاب خواب، خرینہ علم وادب، لاہور، ۲۰۰۴ء، فلیپ
۴۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ثمینہ راجہ، مشمولہ خواتین کی شاعری میں عورتوں کے مسائل کی تصویر کشی، وزارت ترقی خواتین، پاکستان، ۲۰۰۵ء، ص ۲۱۴
۴۸۔ احمد ندیم قاسمی، "صنف نازک کی شاعری"، مرتبہ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۲۷۷
۴۹۔ احمد ندیم قاسمی، منصورہ احمد کی شاعری"، دیباچہ طلوع، ص ۱۸، س، ن
۵۰۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، صنف نازک کی شاعری، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۲۳۹
۵۱۔ احمد ندیم قاسمی، دیباچہ، " محبتیں جب شمار کرنا، نوشی گیلانی، س، ن
۵۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، "صنف نازک کی شاعری"، مرتبہ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، الحمد پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۶ء، ص ۲۶۸
۵۳۔ سلطانہ بخش، ڈاکٹر، پاکستانی اہل قلم خواتین، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۳ء، ص ۱۲۷
۵۴۔ یاسمین حمید، "دوسری زندگی"، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۷ء، فلیپ

پانچواں باب:

مجموعی جائزہ

گذشتہ ابواب میں تحقیق کو مد نظر رکھتے ہوئے اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو سماجی شعور کسی بھی معاشرے میں ہونے والی تبدیلی سے آگاہ رہنے کو کہتے ہیں۔ سماج، لوگوں کا گروہ جو باہم متحد کسی جگہ یا ریاست جہاں انسان اپنی روایات، رسم ورواج، مذہب کے نظام کے تحت مل کر زندگی گزارتے ہیں۔ انسان ابتداء میں جنگلوں اور غاروں میں زندگی بسر کرتا تھا لیکن وقت اور حالات کے تحت اس کی ضروریات نے معاشرے کو متعارف کروایا کیونکہ قدرتی آفات، ماحولیاتی عناصر کا انسان اکیلے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ قدرتی عناصر سے خود کو محفوظ رکھنے اور ان کو اپنے تابع کرنے کے لیے اسے دوسرے انسانوں کی ضرورت تھی اور انسانی نسل بقا کے لیے سماج کا قیام ضروری تھا اسی ضرورت کے تحت انسان نے چھوٹے چھوٹے گروہ کی شکل میں رہنا شروع کیا جو بعد میں معاشرے کی صورت اختیار کر گیا۔ ابتدا میں انہی ضرورتوں کے پیش نظر معاشرے کو قیام عمل میں لایا گیا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ انسان اپنی قائم کی گئی حدود تجاوز کر گیا اور ایک دوسرے کے حقوق غاصب کرنے لگا۔ معاشرہ چھوٹے بڑے طبقوں میں تقسیم ہو گیا۔ جاگیر دارانہ اور سرمایہ دار طبقے کا معاشرے پر اثر ورسوخ بڑھتا گیا جس کی وجہ سے معاشرہ خوشگوار زندگی کی بجائے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا۔

ادب اپنے عہد کے سماجی رویوں کا عکاس ہوتا ہے وہ چاہے کسی بھی خطے، ملک، ریاست یا علاقے سے تعلق رکھتا ہو، اس پر اس خطے، ملک، ریاست یا علاقے کے سماج کا براہ راست اثر ہوتا ہے۔ کسی سماج کی خارجی و باطنی خصوصیات کو سمجھنے کے لیے ادب ایک اہم حوالہ ہے۔ اصناف ادب میں شاعری اپنی ہیت اور دیگر خوبیوں کی بنا پر اس ضمن میں زیادہ مفید ہے کیونکہ زندگی کی رنگا رنگی، تنوع اور وسعت اس صنف میں نظر آتی ہے۔ سماج محض افراد کے مجموعے کا نام نہیں ہے اور نہ ہی سماجی شعور سے مراد محض تبدیلیوں سے آگاہ رہنا بلکہ افراد کی موجود زندگیوں کا علم رکھنا ہے اور معاشرے میں قائم دائروں کے مختلف زاویوں سے آگاہ رہنا۔ اردو شاعری پر معاشرے کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔ اردو کے جتنے بھی شعراء تاریخ میں ہمیں ملتے ہیں۔ ان سب کی شاعری کے پس منظر میں ہمیں سماج، سماجی شعور اور فکر کے موضوعات نظر آتے ہیں۔ اس مقالے کی تمام تر بحث اس تناظر میں ہے اور اس مقالے میں حمیدہ شاہین کی شاعری میں سماجی شعور کا مطالعہ کیا گیا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد بہت سی مشکلات سامنے آئیں۔ جن میں غربت، افلاس، ہجرت، طبقاتی تقسیم، دہشت گردی اور استحصال شامل ہیں جن کا براہ راست معاشرے اور ادب پر اثر پڑا ہے۔ کسی بھی معاشرے میں ہونے والی تبدیلیاں اس کے تخلیق کار کی تخلیق پر گہرے اثرات چھوڑتی ہیں۔ اردو شاعری میں قیام پاکستان کے بعد نئے تجربات اور نئی جہات سامنے آئیں۔ بدلتے تقاضوں اور حالات کے مطابق ادب کی دوسری اصناف کی طرح اردو شاعری میں تنوع آیا ہے۔ رومانوی اور ترقی پسند موضوعات کی طرح سماجی شعور بھی شاعری میں نمایاں ہے کیونکہ کوئی بھی شاعر اپنے خارجی اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اردو شاعری میں سماج سے متعلق، سماج میں ہونے والی تبدیلیوں کے متعلق موضوعات کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔ آج کے دور میں شاعری کے موضوعات پھیلے ہوئے ہیں۔ ہر عہد سے جوڑا ہوا شاعر اپنے عہد کے معاشرتی اور سیاسی معاملات کے بارے میں اپنا ایک علیحدہ نظریہ رکھتا ہے اور وہ اپنی تخلیق کے ذریعے اپنے عہد کے سماجی نظریات اور فکر کو دوسرے عہد تک پہنچانے کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ اردو کی دیگر اصناف ادب کی طرح اردو شاعری میں بھی عہد بہ عہد سماجی شعور کا بھرپور اظہار نظر آتا ہے۔

شاعری ادب کی ایک اہم صنف ہے۔ اگر اردو شاعری کی روایت دیکھیں تو یہ پتہ چلتا ہے۔ اردو شاعری کا آغاز دکن سے ہوا۔ اس دور میں شاعری نے ترقی کی اس عہد کے شعرا اپنے سماجی حالات و مسائل پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان سب کی شاعری کے پس منظر میں ہمیں سماج، سماجی شعور اور فکر کے موضوعات ملتے ہیں۔ اس عہد کے دوہے، غزل، پہیلیاں، شعر، مثنوی اور قصیدوں میں اس عہد کے رسم ورواج تہوار اس عہد کے مقامی و سماجی رنگ کی عکاسی کرتے ہیں۔ اردو شاعری کے جتنے بھی بڑے شاعر ہیں۔ مثال کے طور پر امیر خسرو، محمد قلی قطب شاہ، میر جعفر، ماہ لقاء چندا بائی، میر و سودا، خواجہ میر درد میر تقی میر اور نظیر اکبر آبادی ان کے ہاں سماجی موضوعات، اس دور کے معاشرے کے زوال، رسوم ورواج اور سیاست کے حوالے سے موضوعات نمایاں نظر آتے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر جو مغلیہ دور کے آخری چشم وچراغ ہونے کے ساتھ شاعر بھی تھے۔ ان کی شاعری میں ان کے عہد کی حقیقت نگاری، مغلیہ دور کا زوال اور سماجی انتشار کی جھلک نظر آتی ہیں۔ ذوق اور غالب کے ہاں دلی کے حالات، اپنے عہد کی زندگی، معاشرتی اور کائناتی مسائل کے موضوعات موجود ہیں۔ مومن خان مومن، مرزا دبیر، داغ دہلوی، علامہ اقبال انیسویں صدی کے اہم شعراء ہیں۔ موالانا حالی کی نظموں میں اس عہد کے زوال کا نوحہ، سماج کی ابتری حالت اور انتشار کا نوحہ ملتا ہے جبکہ علامہ اقبال کے ہاں ہمیں معاشرتی موضوعات کے علاوہ مغربی و مشرقی سیاست و زندگی کے مسائل پر مباحث ان کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔

۱۹۳۶ء ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعراء نے نظم کو فوقیت دی اور موضوعات میں وسعت نظر آئی۔ اس عہد سے جڑے شعراء نے اس دور کی معاشرتی و معاشی بد حالی اور طبقاتی تقسیم کو اپنا موضوع سخن بنایا۔ جن میں جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، احسان دانش، فیض احمد فیض اور ساحر لدھیانوی وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے اپنے عہد کی معاشرتی بے کسی، پستی اور غلامی کے مسائل پر قلم اٹھایا لیکن قیام پاکستان کے بعد ہجرت، افلاس، تقسیم، فسادات کی وجہ سے بہت معاشرتی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ قتل و غارت، شہروں کی بربادی اور ہجرت یہ سب ایسے موضوعات ہیں جو شعرا کے ذہنوں پر براہ راست اثر انداز ہوئے۔ ان موضوعات پر تقریباً اس دور کے تمام شعراء نے اپنی اپنی آواز بلند کی۔ ان میں ن م راشد، احمد فراز، میر اجی، ناصر کاظمی، احمد ندیم قاسمی اور مجید امجد وغیرہ شامل ہیں۔

اردو شاعری میں جہاں شعراء نے سماجی مسائل اور اس کے تناظر میں آنی والی مشکلات پر قلم اٹھایا۔ وہاں ایسی شاعرات بھی نظر آتی ہیں جنھوں نے ہجرت، جلا وطنی، قتل و غارت، ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں کے علاوہ مارشل لا جیسی اہم بدلتی تبدیلیوں اور ان کے معاشرے پر ہونے والے اثرات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ادا جعفری، زہرا نگاہ، پروین فنا سید ان اولین شاعرات میں سے جنھوں نے اردو شاعری میں باقاعدہ تانیثیت کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے اپنی آواز کو بلند کیا۔ اسی طرح کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، سارا شگفتہ، پروین شاکر، شاہدہ حسن، فاطمہ حسن، شبنم شکیل، عرفانہ عزیز، شاہین مفتی، ثمینہ راجہ اور نوشی گیلانی اردو کی اہم شاعرات ہیں۔ جنھوں نے نا صرف عورتوں کے حق کے لیے آواز اٹھائی بلکہ اپنے عہد میں ہونے والی معاشرتی تبدیلیوں، سماجی مسائل و نفسیات، معاشرتی و سیاسی اونچ نیچ، طبقاتی تقسیم و استحصال، جاہلانہ رسوم و رواج کو اپنے اپنے انداز اور طرز اسلوب میں موثر انداز میں بیان کیا ہے۔

پاکستانی شاعرات کی شاعری میں سماجی شعور نمایاں نظر آتا ہے۔ انہی شاعرات میں ایک شخصیت حمیدہ شاہین بھی ہیں حمیدہ شاہین ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ وہ پاکستانی اردو شاعری میں ایک الگ پہچان اور معتبر حوالہ رکھتی ہیں۔ انھوں نے تخلیقی اظہار کے لیے اردو نثر اور شاعری دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن شاعری میں حمیدہ شاہین ایک نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ انھوں نے غزل اور نظم دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ حمیدہ شاہین اپنی غزلوں اور نظموں کے اسلوب اور موضوعات کے حوالے سے ہم عصر شعراء میں انفرادیت رکھتی ہیں۔ ان کے سوچنے کا انداز اور بات کرنے کا ڈھنگ دیگر شعرا سے منفرد ہے۔ حمیدہ شاہین کی شاعری میں صنفی تفریق سے ہٹ کر زندگی و کائنات کی مسائل پر غور و فکر کا رویہ نظر آتا ہے۔ حمیدہ شاہین کی غزل میں متنوع موضوعات ہیں ان کی غزلوں میں روایتی موضوعات کی بجائے زندگی کے بدلتے ہوئے زوایے، حقیقت پسندی اور خیالی رویے موجود ہے۔ ان کے موضوعات کافی حد تک حقیقت نگاری کے عکاس ہیں ۔ حمیدہ شاہین کی شاعری میں سادگی، سچائی، حسن اور

گہرائی نظر آتی ہے۔ انہوں نے غزل جیسی بحر مشکل صنف سخن میں بے حد خوبصورتی سے تشبیہات اور استعارات کا استعمال کیا ہے کہ پڑھنے والا ان کی غزل پر رکنے، سوچنے اور داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہیں۔ ایک خاتون شاعرہ ہونے کے باوجود انہوں نے نسوانی موضوعات اور معاملات میں اس طرح کے جنسی استعاروں کا استعمال نہیں کیا، جس طرح آجکل کی نئی شاعرات کر رہی ہیں۔ حمیدہ شاہین نے خدا ی عطیے میں ملاوٹ کی بجائے اپنے شعری وجدان پر اعتماد کیا۔ حمیدہ شاہین کی غزل میں ہمیں نسائی ذات کی آگہی کا جو رویہ سامنے آیا ہے۔ اس میں بغاوت نہ ہونے کے برابر ہے بلکہ ان کے ہاں اعتماد نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں آگاہی ہمیں مشرقیت کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ اردو شاعری میں شاعرات مرد کے تخت و تاج کا تمسخر اور دھجیاں اڑاتے نظر آتی ہے جبکہ حمیدہ شاہین کے ہاں ایک دوسرا رویہ دیکھنے کو ملا ہے۔ وہ مرد کے تخت و تاج اور اس کی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے عورت کی حیثیت کو ماننے کی شرط عائد کرتی ہے۔ حمیدہ شاہین کی غزل کے سماجی شعور کا مرکز ان کے ارد گرد اور اپنی زمین کے مسائل و معاملات ہیں۔ انہوں نے اپنی غزل میں صرف سماجی صورتحال کو بیان ہی نہیں کیا بلکہ اس کا تجزیہ کر کے ان اسباب کا سراغ بھی لگایا ہے جن کی وجہ سے سماج اس تباہی کے دہانے تک آپہنچا۔ حمیدہ شاہین کی غزل میں سماجی شعور پوری آب و تاب اور تخلیقی توانائی کے ساتھ جاگزیں ہیں۔ ان کی غزل میں نئی اور انوکھی لفظیات استعمال ملتا ہے۔ ان کے ہاں الفاظ کا برتاؤ اور سلجھا ہوا شعور ملتا ہے۔ وہ موضوع کی مناسبت سے الفاظ استعمال کرتی ہیں۔ مشکل سے مشکل ردیفوں کو اس سہولت سے نبھاتی ہیں کہ قاری داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ان کی غزل میں رسم و رواج، عورت کا مقام، جبر و استحصال، سماجی زندگی کے مسائل، شرقیت، اخلاقی اقدار جیسے گہرے اور معاشرے سے جڑے اہم موضوعات نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں فکری عناصر کی فراوانی نظر آتی ہے۔ حمیدہ شاہین نے اپنی غزل میں نئے اور منفرد موضوعات کے ساتھ نئی تشبیہات و استعارات کو خوش سلیقگی سے استعمال کیا ہے۔ انہوں نے اپنی غزل میں جدیت کے ساتھ روایتی اصولوں کی بھی پاسداری کی ہے۔ حمیدہ شاہین کی غزل کو اگر دیکھا تو ان کی غزل کے موضوعات صنفی تفریق سے ہٹ کر ہیں۔ ان میں اخلاقی اقدار، جبر و استحصال، طبقاتی سماج کے خلاف احتجاج، سماجی مسائل اور معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں کا کرب ملتا ہے۔

حمیدہ شاہین نے غزل اور نظم دونوں اصناف میں موضوعات کی توسیع کی ہے، انہوں نے اپنی نظموں میں بہت سے تجربات کیے ہیں۔ ان کی نظموں کے موضوعات میں سماجی زندگی کے پہلو نمایاں موضوعات کی صورت میں موجود ہیں۔ وہ زندگی کے خارجی اور باطنی پہلوؤں کے علاوہ سماجی حالات و واقعات کو اپنی نظموں میں سموتی نظر آتی ہیں۔ ان کی نظم میں سماجی فکر و سماجی کرب کا اظہار ملتا ہے۔ ان کی نظموں کے موضوعات اپنے لحاظ سے منفرد ہیں، جو دوسرے شعراء میں ان کی انفرادیت پیدا کرتے ہیں۔ حمیدہ شاہین کی نظموں میں حقیقت پسندی اور سماجی مسائل نظر

آتے ہیں جو کہیں تفہیم کے لحاظ سے مشکل ہیں اور کہیں تفہیم کے لحاظ سے آسان ہیں۔ حمیدہ شاہین نہایت سادگی سے اپنے ارد گرد کے حالات، معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں کو اپنی نظموں میں سموتی نظر آتی ہیں۔ ان کی نظمیں جتنی سادہ ہیں اتنی ہی معنوی لحاظ سے ان میں وسعت اور گہرائی ہے۔ حمیدہ شاہین کے لہجے میں بے باکی کی بجائے شائستگی اور متانت نظر آتی ہے اور ان کی نظموں میں آنے والے واقعات اور واردات کتنی ہی سنگین کیوں نہ ہو ان کے ہاں تلخی نظر نہیں آتی۔ حمیدہ شاہین کی نظموں میں کہیں کہیں طاقت اور رجائیت اپنا احساس دلاتی ہے۔ ان کی نظموں میں عمومی رواج کے مطابق محض انفرادی اظہار ہی نہیں بلکہ سماج میں بھی پسی ہوئی زندگی کو سمجھنے کی کوشش موجود ہے۔ ان کے ہاں ایسی نظمیں موجود جو ان کے دور کے سماجی شعور کی عکاس ہیں۔ ان نظموں میں شاعرہ نے استعاراتی اور تمثیلی انداز میں ہمارے سماجی پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔ انہوں نے سماج میں بسر ہونے والی زندگی کی تصویر کشی کی ہے۔ حمیدہ شاہین کے ہاں زندگی اور سماج میں گہرا ربط ہے۔ حمیدہ شاہین کی نظموں میں موجودہ دور کی زندگی اور مسائل کے بارے میں ان کے ہاں گہری سوچ اور فکر نمایاں ہے۔ حمیدہ شاہین کی نظموں میں روزمرہ کے مسائل سے لے کر، معاشرتی رویوں اور اخلاقی اقدار تک اور عورتوں کے مسائل اور نفسیات، دینی اور سماج گویا تمام طرح کے موضوعات ہمیں نظر آتے ہیں۔ غزل کی طرح ان کی نظم میں رسم ورواج، عورت کا مقام، جبر و استحصال اور اخلاقی اقدار جیسے فکری رویے ملتے ہیں۔ ان کی نظموں کا اسلوب، تشبیہات و استعارات اور زبان و بیان ان میں خوبصورتی اور احسن پیدا کرتا ہے۔ حمیدہ شاہین کی نظموں میں ہمیں ایسی نظمیں بھی نظر آتی ہیں۔ جن کے مطالعے سے قاری کی بصیرت میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس سے ایسے مناظر بھی سامنے آتے ہیں۔ جن کی اکثر چشم پوشی کی جاتی ہے۔ ایسے موضوعات قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ حمیدہ شاہین کی نظموں میں سیاسی، سماجی، پہلوؤں کے علاوہ بین الاقوامی مسائل بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی نظمیں "آئینیہ"، "آمریت"، "ان ڈور پلانٹ"، "یقین سے بکھرا ہوا سچ"، "مری ہمراز دیواروں میں سوئیاں کس نے گاڑی ہیں"، جیسی نظموں میں ان کے سماجی رویے کا پتہ چلتا ہے کہ حمیدہ شاہین اپنے ارد گرد کے ماحول سے غیر آگاہ نہیں ہیں۔ ان کی نظموں کے موضوعات گھر کی چار دیواری سے شروع ہو کر ارد گرد کے معاشرے سے جڑے ہوئے ہیں۔

زندگی کے دوسرے شعبہ جات کی طرح شاعری میں بھی خواتین بھرپور طریقے سے نمائندگی کرتی ہیں۔ اردو شاعری میں خواتین شعراء نے دونوں اصناف یعنی غزل اور نظم میں طبع آزمائی کی ہے۔ حمیدہ شاہین اور ان کی اہم معاصر شاعرات چونکہ پاکستانی و ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور سماج سے تعلق رکھتی ہیں لہذا اس لیے ان کے اکثر و بیشتر مسائل و موضوعات مشترک ہیں۔ تمام شاعرات کے ہاں ہمیں ارد گرد کے ماحول، عورت کے مسائل اور شناخت کے علاوہ دیگر موضوعات بھی ملتے ہیں۔ اس باب میں ادا جعفری، پروین فنا سید، زہرا نگاہ، کشور ناہید، شبنم

شکیل، فہمیدہ ریاض، شائستہ حبیب، نسرین انجم بھٹی، پروین شاکر، شاہین مفتی، فاطمہ حسن، شاہدہ حسن، سارا شگفتہ، ماہ طلعت زاہدی، عشرت آفرین، ثمینہ راجہ، منصورہ احمد، نوشی گیلانی، یاسمین حمید کے سماجی شعور کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پاکستانی اردو شاعرات میں ادا جعفری کو خاتونِ اول کہلاتی ہیں۔ یہ پہلی شاعرہ ہیں جنہوں نے پر قلم اٹھایا اور مردوں کے خلاف اپنی آواز بلند کی۔ ان سے پہلے جو آوازیں تھیں، وہ آوازیں دبی دبی تھیں اور تعداد کے لحاظ سے کم تھیں۔ غزل میں ادا جعفری کا ایک خاص طرز ہے انہوں نے پہلی مرتبہ غزل میں تانیث کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ ان کی شاعری میں ذات اور وجود کی آگہی کا رویہ سامنے آیا ہے۔ ان کے موضوعات میں ممتا کا احساس انسان دوستی اور انسانیت پر یقین کے علاوہ احترام اور انسانی سماج کی بقا کا درس وغیرہ نظر آتا ہے۔ ادا جعفری نے اپنی نظموں میں مختلف معاشرتی مسائل کے درد کی تصویر پیش کی ہے۔ یہ سماجی المیے ہی سماج میں غیر مساویت کا سبب بنتے ہیں۔ ادا جعفری کی شاعری میں سیاسی و سماجی جبر کا پہلو بھرپور ہے لیکن اس جبر کے خلاف ان کے لہجے میں احتجاج باغیانہ نہیں ہے۔ ان کی شاعری عصری حقیقتوں اور سماجی تلخیوں کی نہایت خوبصورتی سے ترجمانی کرتی ہے۔

پروین فنا سید سماج میں موجود بے اعتدالیوں اور فکر و اظہار پر پابندیوں کے خلاف آواز بلند تو کرتی ہیں لیکن ان کا لہجہ باغیانہ نہیں ہے۔ وہ سماج میں ہونے والے ظلم و ستم سے پریشان تو ہوتی ہیں لیکن اس ظلم و زیادتی کے ساتھ سمجھوتہ کرنا ان کے مزاج کے برعکس ہے۔ پروین فنا سید بین الاقوامی سامراجی استحصالی طاقتوں کی ریاکار چالوں، طاقت کے حصول اور حکمرانی کی خواہش، بھوک، افلاس اور جنگ و جدل کے خلاف آواز اٹھاتی ہیں۔ زہر انگاہ کے ہاں جنگ اور اس کے عوام پر ہونے والے اثرات کے حوالے سے موضوعات نظر آتے ہیں۔ ان کی نظمیں انسانیت کی دل سوز مناظر کی عکاسی ہیں جس کی عمدہ مثالیں "ویت نام" اور "جنوبی افریقہ" ہیں نچلے طبقے اور مزدور طبقے کی مجبوریوں بھری زندگی کے حوالے سے بھی ان کی نظموں میں موضوعات موجود ہیں۔ ان کے ہاں ظلم و جبر کے خلاف رد عمل دکھائی دیتا ہے۔

کشور ناہید مساوات کی قائل ہیں۔ وہ کسی بھی قسم کی جابرانہ حاکمیت کو نہیں مانتی بلکہ انہوں نے طبقاتی نظام کے خلاف ہمیشہ اپنی آواز بلند کی ہے۔ ان کی آواز پاکستانی معاشرے میں انقلابی باتوں کی وجہ سے نمایاں رہی ہے۔ اس کی وجہ کشور ناہید کو بہت جدوجہد بھی کرنی پڑی۔ بے شمار طعنوں اور ملامتوں کا نشانہ بننے کے باوجود کشور ناہید نے ایک مضبوط عورت ہونے کا ثبوت دیا۔ کشور ناہید کی شاعری میں صرف سطحی مناظر کی عکاسی کے ساتھ تجربات کا گہرا شعور بھی نظر آتا ہے۔ فہمیدہ ریاض وہ پہلی شاعرہ ہیں جن سے پہلے اردو شاعری میں خالص نسائی تجربات اور محسوسات کے موضوعات نظر نہیں آتے۔ ان کی شاعری میں سماجی جبر کے خلاف احتجاج نظر آتا ہے۔ فہمیدہ ریاض نے معاشرے میں ہونے والے ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھائی بغاوت کی۔ جس کے بدلے میں ہر موڑ پر مشکلات،

رکاوٹیں اور طعنے نصیب بنے مگر وہ بڑے حوصلے سے اپنی منزل کی جانب گامزن رہیں۔ سارہ شگفتہ اپنی شاعری میں معاشرے کی جعل سازی، دورخی اور مکاری کا پردہ بڑی سفاکی سے چاک کرتی نظر آتی ہیں۔ ان کا لہجہ تلخ ہے اور اس پر کہیں کہیں بے رحمی کا گہرا سایہ ہے۔

شبنم شکیل کی شاعری میں ہمیں معاشرے کی ناہمواریوں اور ناانصافیوں کے تذکرے ملتے ہیں۔ ان کے ہاں انسانی زندگی کی حقیقتوں کو سامنے لانے کے ساتھ ساتھ زندگی کے پہلو میں چھپی سچائیوں کی تلاش ہے۔ شبنم شکیل کی ہاں سماجی مسائل کے موضوعات کے ساتھ مستقل حوصلہ اور امید نظر آتی ہے۔ وہ زندگی کی راہوں میں حوصلہ ہارنے کی بجائے سفر جاری رکھنے پر یقین رکھتی ہیں ۔شاہدہ حسن کی غزلوں میں تازہ ہجرتوں کے زخم، کرب ہجرت سے بوجھل دکھوں کی بہت سی پرچھائیاں، ترک وطن کا دکھ اور اس کے باعث ملنے والے بے گھری اور بے مہری کی واضح جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ان کے ہاں بغاوت تلخی بن کر ابھرنے کی بجائے نرم احتجاج تنقید اور تبصرے کی صورت میں نظر آتی ہے جو انہیں دیگر شاعروں سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کی غزل کے اسلوب میں نئے شعری مزاج کے ساتھ عصری شعور اور کلاسیکی روایات کا نہایت خوبصورت امتزاج ملتا ہے ۔فاطمہ حسن کی شاعری میں غنائیت اور ترنم بھرپور نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں محبت، معاشرتی اقدار کے علاوہ نسائی طرز احساس بھی موجود ہے۔ فاطمہ حسین نے اپنی شاعری میں روایتی علامتوں اور تلازموں کو ایک نئے انداز میں استعمال کیا ہے۔ ان کی شاعری میں تصور محبت مکمل اور بھرپور ہے۔ ان کے ہاں ماضی کا رویہ دیگر شاعرات کے برعکس بھرپور ہے کیونکہ انہیں سقوط ڈھاکہ کے وقت پاکستان ہجرت کرنے کیلیے بہت سی مشکلیں برداشت کرنی پڑی۔ فاطمہ حسن کی شاعری میں باطنی جذبات و کیفیات کے ساتھ معاشرتی مسائل موجود ہیں۔

شائستہ حبیب کے ہاں نظموں میں باطنی واردات اور تجربات اتنے واضح ہیں کہ ان میں پیچیدہ علامتیں اور تمثیلیں تفہیم میں حائل نہیں ہوتی وہ سماجی حقیقتوں کو کسی ڈھکے چھپے انداز میں بیان کرنے کی بجاے وہ اپنی نثری نظم میں وضاحتی انداز اپناتے ہوئے ساری داستاں بیان کر دیتی ہیں۔ نسرین انجم بھٹی کے ہاں زندگی کی تلخیوں اور بے معنویت کے موضوعات نظر آتے ہیں ان کے بقول خارجی جبریت کی گردشیں انسان کو اندر ہی اندر ختم کرتی جاتی ہے۔ ہر قدم پر استحصال ہونا انسانیت سوز شرم ناک مناظر انسانی اقتدار کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ یہ عمومی رویہ نسرین انجم بھٹی کی شاعری میں مختلف کیفیتوں میں سامنے آتا ہے ۔شاہین مفتی کے ہاں خوشی کے لمحات کے بیان کی بجائے دکھ اور دکھوں، ہجرتوں اور فاصلوں کے کرب ملتے ہیں۔ شاہین مفتی کا سماجی و عصری شعور بھی ان کی باطنی کیفیات سے مزین ہے شاہین مفتی کا رویہ معاشرے کے لیے مکمل طور پر نفی نہیں ہے۔ وہ محبت کی علمبردار ہوتے ہوئے بھی اپنے اردگرد کے حالات سے پوری طرح آگاہ رہتی ہیں۔ وہ اپنی نظموں میں الفاظ کے برمحل استعمال سے اچھی طرح

واقف ہیں۔ ان کی شاعری میں موسیقت اور ترنم ہے جو عہد حاضر کی نظموں میں کم و بیش ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں جدیدیت کے پس منظر میں کلاسیکی روایات کا گہرا شعور ہے۔ ان کی نظموں کے استعارے اور علامتیں معنیٰ خیز ہیں شاہین مفتی مشکل سے مشکل موضوعات کو نہایت سادہ اور مختصر الفاظ میں بیان کیا ہیں۔ شاہین مفتی اردو شاعرات میں جدیدیت کے ایک فکری زاویے اور وجودیت کی بہترین مثال ہیں۔

ماہ طلعت زاہدی کی شاعری میں نئی دنیا کے نئے انسان اور نئے حالات کے بارے میں گہرا شعور ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں ہمارے مختلف سماجی مسائل اور المیوں، ارگرد میں موجود زندگی پر چھائی موت، وحشت، بھوک و افلاس کے موضوعات ملتے ہیں۔ عشرت آفرین کی شاعری میں عصر حاضر کے شعور کی واضح جھلک، وطن سے اپنی مٹی سے سرزمین اور اس کے بدحال لوگوں کے دکھ سکھ اور ان سے محبت کے پہلو نمایاں نظر آتے ہیں۔ ثمینہ راجہ نے پنے عہد کی بے حسی، نسوانی مسائل اور معاملات کے علاوہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو اپنی غزل کے موضوعات میں سمویا ہے۔ ان کی نظمیں "بمباری کے بعد" "مرگ بر امریکہ" وغیرہ اس عہد کی بے حسی کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ان کی غزلوں میں ہمیشہ ہمیں تاریخی شعور بھی نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں معاشرتی، معاشی وسیاسی انتشار کے علاوہ تہذیبی شکست کے اہم موضوعات نمایاں ہیں۔

منصورہ احمد کی نظموں میں درد کی ہلکی ہلکی کسک اور عصری شعور کی واضح جھلک دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے انسانی زندگی کا پورا منظر نامہ، ملکی سیاست سے لے کر بین الاقوامی استحصالی، ہتھکنڈوں اور سماج کے عام فرد سے لے کر اپنی ذات تک کے تمام موضوعات اپنی شاعری میں سمو دیئے ہیں۔ نوشی گیلانی کی شاعری داخلی جذبات کی عکاسی کے علاوہ معاشرتی، سیاسی و سماجی زندگی کی تلخ سچائیوں، دکھ، ہجرتوں کے زخم، نادید منزلوں کا خوف اور تنہائی کے موضوعات مسلسل نظر آتے ہیں۔ نوشی گیلانی کی نظموں اور غزلوں میں رائیگانی اور ان کے اسلوب میں اظہار کا خوب صورت سلیقہ، ان کے لہجے کے ساتھ الفاظ کا انتخاب، مخصوص الفاظ، تلازمے اور علامتیں ان کے وژن کی عکاسی کرتے ہیں۔ نوشی کی شاعری میں ان کے مزاج کی نفاست، دھیما پن ہے یا سمین حمید کے ہاں روایت اور جدیدیت کے امتزاج ساتھ بیان کی شگفتگی اور فنی پختگی کا احساس نمایاں ہے۔

تمام خواتین شاعرات ہونے کی وجہ سے ان سب میں جو نمایاں موضوع رہا ہے۔ وہ عورت اور عورت کے مسائل ہیں۔ ان میں سے کچھ شاعرات کے ہاں ہمیں بے باک لہجہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ جب کہ کچھ کے ہاں دھیما لہجہ دکھائی دیتا ہے۔ ان شاعرات کے ہاں عورت کے علاوہ معاشرتی پہلو پر موضوعات واضح انداز میں نظر آتے ہیں۔ ان کی انفرادیت ان کی شاعری کا اسلوب زبان و بیان، تشبیہات و استعارات کا الگ انداز میں استعمال اور الگ مزاج ہے۔ حمیدہ شاہین کا تعلق بھی ان شاعرات کے طبقے سے ہے لیکن انھوں نے عورت ہوتے ہوئے بھی اپنی شاعری میں کبھی

عورت کو غالب نہیں آنے دیا۔ انھوں نے دوسری شاعرات کی طرح عورت ہونے کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ وہ عورت کی شناخت کا تقاضا کرتی ہیں جبکہ وہ مرد کی برتری کو بھی تسلیم کرتی ہیں اسی برتری کو تسلیم کرتے ہوئے وہ چاہتی ہیں کہ عورت کو بھی برابری کے حقوق دیئے جائیں۔ وہ مرد کے رتبے کو مانتے ہوئے عورت کے حقوق کا مطالبہ کرتی ہیں۔

حمیدہ شاہین نے موجودہ استحصالی نظام میں بے یقینی اور عدم تحفظ کا جو عکس دکھانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے وہ صرف عورت کے لیے مختص نہیں کیا بلکہ پورا معاشرہ اس کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ وہ اس موضوع پر لکھتے ہوئے عورت کے وجود کو پیش نظر رکھنے کی بجائے جبر و استحصال کی شکار اس پوری معاشرتی صورت حال کو بیان کرتی ہیں۔ حمیدہ شاہین انسانی زندگی کے کسی انسانی زندگی کے کسی ایک مسئلے کو بیان کرنے کی بجائے اجتماعی انسانی مسائل و معاملات کے ساتھ منسلک رہنا زیادہ پسند کرتی ہیں۔

حمیدہ شاہین نے اپنی شاعری میں نئی تشبیہات و استعارت استعمال کیے ہیں جن کا استعمال اس سے پہلے ہمیں نظر نہیں آتا۔ ان کے منفرد اسلوب، تشبیہات و استعارات اور مزاج نے انھیں ایک الگ پہچان دی ہے۔ جہاں تک بات عصری اور سماجی مسائل کی ہے وہاں حمیدہ شاہین ایک حقیقت پسند شاعرہ کے طور پر انسانی رویوں، سماجی و معاشی مسائل، سیاست اور دیگر دوسرے موضوعات پر قلم اٹھاتی ہیں۔ ان کے ہاں ہمیں سماجی شعور کی پختہ روایت ملتی ہے۔ ان کی نظمیں "عدالت"، "تین سالہ بچی کا ریپ"، "منصف کی کرسی خالی ہے" دیگر ایسی نظمیں ہیں جن میں شاعرہ نے سماجی رویوں، مسائل اور معاشرے میں رہنے والے افراد کے رویوں اور شعور کو موضوع بنایا ہے۔

نتائج:۔

ابتداء میں چند تحقیقی سوالات بتائے گئے تھے ان کو مد نظر رکھتے ہوئے اس تحقیق کے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آئے ہیں۔

حمیدہ شاہین ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں جنہوں نے اردو نثر نگاری کے ساتھ ساتھ شاعری بھی کی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کی وجہ سے ادبی حلقوں میں اپنی ایک الگ پہچان بنائی ہے۔ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے پیچھے ان کی زندگی کے مختلف واقعات اور تجربات کار فرما رہے ہیں۔ حمیدہ شاہین کی نگاہ اپنے ارد گرد کے ماحول اور معاشرے کے ہر پہلو کی طرف جاتی ہے جس کی وجہ سے ن کے ہاں ہمیں موضوعات کی نئی جہات ابھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی شاعری میں ہمیں ماضی اور حال کی تہذیبی اقدار و روایات کا امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ ان کے ہاں قدیم ثقافتی، معاشری اور تہذیبی اقدار و مسائل کے ساتھ جدید دور کی تہذیبی اور سماجی مسائل بھی ملتے ہیں۔ ان کے موضوعات میں تنوع ہے زبان و بیان رواں اور اسلوب میں دلکشی ہے۔ جدید عہد سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ روایت سے منسلک نظر آتی ہیں۔

۱۔ حمیدہ شاہین نے اپنی شاعری میں ایسے ماحول اور سماج کو پیش کیا ہے جو طبقاتی تقسیم اور اخلاقی اقدار کے زوال کا شکار ہے۔ انہوں نے سرمایہ دار، حکمران اور جاگیر دار طبقے کے رویوں، ناانصافیوں اور اس طبقے کی نچلے طبقوں کے ساتھ رویے، جذباتی و ذہنی مسائل کا تجزیہ کیا ہے۔

۲۔ ان کی شاعری میں ہمیں عورت کی ذات کی شناخت، عورت کا مقام، جاہلانہ رسم و رواج کے موضوعات نمایاں ہیں۔ اس کے علاوہ محبت اور مشرقی اقدار کے موضوعات بھی نظر آتے ہیں۔ حمیدہ شاہین کی معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں پر گہری نظر ہے۔ ان کے موضوعات ان کے روز مرہ کے مشاہدات اور تجربات کی دین ہیں۔

۳۔ حمیدہ شاہین کو اردو کے علاوہ فارسی، عربی اور دیگر زبانوں پر پورا عبور حاصل ہے۔ عربی، فارسی، اردو اور ہندی زبان کے لہجوں سے واقفیت کی بنا پر انھوں نے اپنی شاعری میں ان زبانوں کے الفاظ کا بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔

۴۔ حمیدہ شاہین کی شاعری کے موضوعات میں وسعت اور تنوع پایا جاتا ہے وہ روایت سے منسلک رہتے ہوئے جدت کی حامل ہیں۔

۵۔ حمیدہ شاہین نے اپنی شاعری میں ہندی الفاظ اور موسقیت کا آہنگ بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے، جس سے ان کی غزلوں اور نظموں میں چاشنی اور ترنم پیدا ہوا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں بحروں کا انتخاب آہنگ اور لفظیات کے مطابق کیا ہے۔

۶۔ حمیدہ شاہین جدید معاصر شاعری میں بحثیت شاعری ایک منفرد شناخت رکھتی ہیں بلکہ یہ کہنا بے جانہ ہو گا کہ آنے والے عہد میں حمیدہ شاہین کا شمار اہم شعراء میں ہو گا۔

سفارشات

اس تحقیق کے بعد سفارشات کے ضمن میں درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں۔

۱۔ زیر نظر مقالے میں تحقیق کا دائرہ حمید شاہین کی شاعری میں سماجی شعور تک محدود تھا تاہم نئے محقق اس دائرے میں مزید توسیع کر سکتے ہیں۔

۲۔ حمیدہ شاہین کی شاعری کے فکری پہلوؤں پر کام سامنے آیا ہے جبکہ ان کی شاعری کے فنی محاسن پر تفصیلی کام کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ حمیدہ شاہین کی شاعری کی سیاسی و تہذیبی اقدار کے تناظر میں تحقیق کی جا سکتی ہے۔ اِن کی شاعری میں سماجی شعور کے علاوہ سیاسی شعور تہذیبی و ثقافتی اقدار کے موضوعات بھی سامنے آئے ہیں، جن پر کام کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ ان کی شاعری میں عورت کی شناخت، عورت کے مسائل، عورت کے مقام اور نفسیات کے حوالے سے ایسے پہلو نظر آتے ہیں جن کو آئندہ لکھے جانے والے مقالہ جات میں زیر بحث لایا جا سکتا ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ:۔

۱۔ حمیدہ شاہین، دستک، کتاب نما، لاہور، جنوری ۱۹۹۵ء

۲۔ حمیدہ شاہین، دشت وجود، ملٹی میڈیا افیرز، لاہور، ۲۰۰۶ء

۳۔ حمیدہ شاہین، زندہ ہوں، ملٹی میڈیا افیرز، لاہور، ۲۰۱۰ء

ثانوی ماخذ:۔

۱۔ ابوالاحفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء

۲۔ احمد فراز، شہر سخن آراستہ ہے (کلیات)، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء

۳۔ ادا جعفری، غزلاں تم تو واقف ہو، مکتبہ فنون، لاہور، ۱۹۷۴ء

۴۔ افتخار عارف، حرف باریاب، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی، ۱۹۹۶ء

۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، اختلافات، مکتبہ اردو زبان، لاہور، ۱۹۷۵ء

۶۔ ایم سلطانہ بخش (ترتیب و تدوین)، پاکستانی ادبیات میں خواتین کا کردار، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء

۷۔ بہادر شاہ ظفر، دیوان ظفر، فرید بک ڈپو پرائیویٹ لمیٹڈ، دہلی، ۲۰۰۲ء

۸۔ ثمینہ راجہ، کتاب خواب، خزینہ علم و ادب، لاہور، ۲۰۰۴ء

۹۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر (مرتب)، کلیات میر اجی، اردو مرکز لندن، ۱۹۸۸ء

۱۰۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، نئی تنقید، رائل بک کمپنی، کراچی، ۱۹۸۵ء

۱۱۔ حبیب جالب، کلیات جالب، ماورا پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۵ء

۱۲۔ خالدہ حسین، خواتین کی شاعری میں عورتوں کے مسائل کی تصویر کشی، وزارت ترقی خواتین، حکومت پاکستان، ۲۰۰۵ء

۱۳۔ ذکائی قادر اس (مرتب)، برگ تازہ، پیش پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء

۱۴۔ رشید امجد، ڈاکٹر، میر اجی، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء

۱۵۔ رفیع الدین ہاشمی، اصناف ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء

۱۶۔ ساحر لدھیانوی، کلیات ساحر، دعا پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء
۱۷۔ سرور الہدیٰ (مترجم)، مینجر پانڈے، ادب کی سماجیات (تصور اور تعبر)، انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی، ۲۰۰۶ء
۱۸۔ سعد اللہ کلیم، ڈاکٹر، اردو غزل کی تہذیبی و فکریں بنیادیں، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء
۱۹۔ سید عبد اللہ، ڈاکٹر، چند نئے اور پرانے شاعر، اردو مرکز، لاہور، ۱۹۶۵ء
۲۰۔ سعادت سعید، ڈاکٹر، شائستہ حبیب کی نظمیں، مشمولہ فن اور خالق، دستاویز مطبوعات، لاہور، ۱۹۹۸ء
۲۱۔ سید نور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر (مرتب) کلیات ولی، نامی پریس لکھنو، ۱۹۸۲ء
۲۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی دبستان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء
۲۳۔ سلام سندیلوی، ڈاکٹر، ادب کا تنقیدی مطالعہ، مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۸۶ء
۲۴۔ شاہین مفتی، مسافت، اساطیر لاہور، ۱۹۹۸ء
۲۵۔ شبنم شکیل، اضطراب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء
۲۶۔ شکیب جلالی، کلیات شکیب جلالی، ریختہ آن لائن ویب سائٹ، مئی ۲۰۰۴ء
۲۷۔ شمس الرحمن فاروقی، انتخاب اردو کلیات غالب، ساہتیہ اکادمی، ۱۹۹۳ء
۲۸۔ ضیاء الحسن، ڈاکٹر، جدید اردو نظم، آغاز و ارتقاء"، سانجھ، لاہور اشاعت اول، ۲۰۱۴ء
۲۹۔ طاہر تونسوی (مرتبہ)، ڈاکٹر، صنف نازک کی شاعری، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء
۳۰۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، جدید شاعری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، علی گڑھ، ۲۰۰۵ء
۳۱۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، غزل اور مطالعہ غزل، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۵۵ء
۳۲۔ عشرت آفریں، دھوپ اپنے حصے کی، شہر زاد، کراچی، ۲۰۰۵ء
۳۳۔ عقیل احمد صدیقی، جدید اردو نظم آغاز و ارتقاء، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، علی گڑھ، ۱۹۹۰ء
۳۴۔ علی محمد خان، ڈاکٹر، لاہور کا دبستان شاعری، مقبول اکیڈمی، لاہور ۱۹۹۲ء
۳۵۔ علی عباس جلالپوری، رسوم اقوام، تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۰ء
۳۶۔ عمران ازفر، نئی اردو نظم، نئی تخلیقی جہت، پورپ اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۳ء
۳۷۔ غفور شاہ قاسم، پاکستانی ادب میں شناخت کی نصف صدی، ریز پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۰۰ء

۳۸۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء

۳۹۔ فتح محمد ملک، چھوٹی حقیقتوں کی طرف سفر، مشمولہ تحسین و تردید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء

۴۰۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو شاعری کا فنی ارتقاء، الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء

۴۱۔ فہمیدہ ریاض، میں مٹی کی مورت ہوں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء

۴۲۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی ۱۹۸۹ء

۴۳۔ کشور ناہید، گلیاں، دھوپ، دروازے، مکتبہ عالیہ ایبک روڈ، لاہور، ۱۹۷۸ء

۴۴۔ محمد ابوالخیر کشفی، سید، ارادو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر، نشریات لاہور، ۲۰۰۷ء

۴۵۔ مبشرہ علی، حمیدہ شاہین کی شعری جہات، کتاب محل، لاہور ۲۰۱۷ء

۴۶۔ محمد حسن، ڈاکٹر، اردو ادب میں رومانوی تحریک، کاروان ادب ملتان، ۱۹۹۳ء

۴۷۔ محمد خاور نوازش، ادب، زندگی اور سیاست، نظری مباحث، مشال پبلرز، فیصل آباد، ۲۰۱۲ء

۴۸۔ محمد زکریا، خواجہ، کلیات مجید امجد، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ستمبر ۲۰۰۶ء

۴۹۔ مرزا غالب، دیوان غالب اردو، نظامی پریس بدیوان، ۱۹۲۷ء

۵۰۔ ممتاز حسین، پروفیسر، امیر خسرو دہلوی حیات اور شاعری، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، لمیٹڈ، ۱۹۸۲ء

۵۱۔ مولوی عبدالحق، قدیم اردو، س،ن

۵۲۔ میر تقی میر، کلیات میر، بترتیب جدید مع مقدمہ فرہنگ، مطبع نامی نولکشور لکھنو، ۱۹۴۱ء

۵۳۔ ناصر کاظمی، انتخاب نظیر، فضل الحق اینڈ سنز پبلشرز لمیٹڈ، ۱۹۹۰ء

۵۴۔ ناصر کاظمی، برگ نے، آزاد بک ڈپو، ہال بازار امرتسر، ۱۹۹۸ء

۵۵۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر رفتہ و آئندہ، پورپ اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء

۵۶۔ ن م راشد، کلیات راشد، کتابی دنیا دہلی، ۲۰۱۱ء

۵۷۔ نوازش علی، ڈاکٹر (مرتبہ) پاکستان کی اردو شاعرات، مشمولہ پاکستان میں اردو ادب کے پچاس سال، دھنک پرنٹرز، ۱۹۹۷ء

۵۸۔ نوشی گیلانی، محبتیں جب شمار کرنا، س،ن

۵۹۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۸ء
۶۰۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، نظم جدید کروٹیں، ادارہ ادبی دنیا، لاہور، ۲۰۰۰ء
۶۱۔ وقار احمد رضوی، ڈاکٹر، تاریخ جدید اردو غزل، نیشنل بک فاونڈیشن، اسلام آباد، طبع اول، ۱۹۸۸ء
۶۲۔ یاسمین حمید، دوسری زندگی، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۷ء

رسائل و جرائد:۔

آئینہ، ماہنامہ، لاہور، شمارہ ۷ جون ۲۰۱۱ء
اخبار جہاں، مستنصر حسین تارڑ، ۱۰ کالم "کارواں سرائے، س،ن
ادب لطیف، ماہنامہ، شمارہ نمبر ۵، مئی ۲۰۰۴
ارتقاء، کتابی سلسلہ، شمارہ ۴۲، جنوری، ۲۰۰۷، کراچی
انگارے ملتان، ماہنامہ، سلسلہ نمبر ۸۷ ستمبر، ۲۰۰۷ء
اوراق، اساطیر، لاہور، ۱۹۹۸ء
بنیاد، جلد دوم، شمارہ ۱۰، لاہور، (لمز)، ۲۰۱۱ء
تحسین و تردید، لاہور، ۱۹۹۵ء
تخلیق، ماہنامہ، لاوہر، شمارہ ۸، اگست ۲۰۰۶ء
چہار سو، مشمولہ ماہنامہ، جلد نمبر ۱۱، شماری مئی اجون ۱۹۹۴ء
طلوع، دیباچہ، س،ن

اخبارات:۔

روزنامہ جنگ، پروین فنا کی شاعری، اسلام آباد (ادبی ایڈیشن) ۱۲ ستمبر ۱۹۹۴ء

لغات:۔

الحاج مولوی فیروز الدین، فیروز اللغات اردو، فیروز، سنز، لاہور، ۲۰۱۰ء
جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، اسلام آباد، ۱۶ مئی ۱۹۹۴ء

راجہ جیسور راؤ اصغر، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء
سید احمد دہلوی، مولوی، فرہنگ آصفیہ، اردو سائنس بورڈ، اپر مال، لاہور، جلد سوم و چہارم، س، ن
وارث سرہندی، علمی اردو جامع لغت، علمی کتاب خانہ، کبیر سٹریٹ لاہور، ۱۹۷۹ء

انگریزی لغات / انسائیکلوپیڈیا :۔

- English oxford living Dictionary,2 April 2007,9:45 pm
- Meaning in Mariam Wepsiter since 1828, 2 April 2007, 9:56 pm
- Oxford Advanced Learner Dictionary, oxford university press, 2014
- Oxford Advanced Learner's Dictionary of current English,A.S Horn, Oxford university press , 2004
- The concise Oxford dictionary of current English , Fowlerm How (Henry Waston), Oxford ,the Clarendon Press,1919
- The social science encyclopedia Edited by Adam Kuper and Jessica Kupper, services bok club, 1989
- Universtist stellen bosc university, 2 April 2017, 10:00 pm

انٹرویو۔

۱۔ ٹیلی فونک انٹرویو، حمیدہ شاہین، لاہور، ۶ ستمبر، ۲۰۱۸ء، وقت، ۱۱:۰۰ بجے

انٹرویو

سوال۔ آپ کی شاعری اگرچہ انسانی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتی ہیں لیکن آپ کے یہاں سماجی مسائل کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ اسکی کوئی خاص وجہ ہے؟

جواب: سماجی مسائل کی عکاسی کا جہاں تک تعلق ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعر اپنے ارد گرد کے ماحول سے متاثر ہوتا ہے یہ ماحول سماج بناتا ہے۔ معاشرہ بناتا ہے۔ لوگ بناتے ہیں۔ چنانچہ ہم اپنے سماج میں رونما ہونے والے تمام واقعات، چاہے وہ خوشی کے ہوں یا غم کے، ان سے متاثر ہوتے ہیں۔ بلکہ ہم خود بھی ان کا حصہ ہوتے ہیں۔ اس لیے شاعری میں ان واقعات کی وجہ سے رنگارنگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ میری کوئی شعوری کاوش نہیں ہے۔ جب بھی کوئی واقعہ میرے دل اور ذہن پر گہرا اثر چھوڑتا ہے وہ شعروں کی صورت میں، میرے کلام کا حصہ بن جاتا ہے۔ میں کوشش کر کے کچھ نہیں لکھتی۔ بس جب آمد ہو اور تخیل اپنے عروج پہ ہو تو یہ سب صفحہ قرطاس پر منتقل ہو جاتا ہے۔

سوال۔ شاعری کی جو کتب لکھ چکی ہیں ان کے علاوہ آپ کی اور کون کون سی کتابیں شائع ہو رہی ہیں؟

جواب: اس کے علاوہ شاعری کی پہلے تین کتابیں آپ جانتی ہیں کہ آچکی ہیں۔ شاعری کی چوتھی کتاب بھی تیار ہے اور کتابت بھی ہو چکی ہے۔ کمپوزنگ ہو چکی ہے۔ اُس پر صرف نظر ثانی کا کام باقی ہے جو میں خود ہی کرتی ہوں چونکہ خود ہی نظر ثانی کرتی ہوں تو اس پر وقت کافی لگ جاتا ہے۔ اس لیے کہہ لیجیے زیر غور ہے۔

جو شاعری کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ غیر مطبوعہ نظمیں اور غزلیں بے تحاشا موجود ہیں کیونکہ شاعری ایک ایسا کام ہے جو کبھی رکتا نہیں ہے ۔ مسلسل چلتا رہتا ہے اگر چہ اس میں ایسے Phase آجاتے ہیں جب کچھ بھی نہیں ہو رہا ہوتا لیکن عام طور پر شاعری کا کام جاری رہتا ہے تو اس لیے غیر مطبوعہ نظمیں اور غزلیں کافی تعداد میں موجود ہیں اور یہی وجہ ہے کہ غزلوں کی کتاب میں تقریباً مرتب کر چکی ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ نظموں کی ایک کتاب مرتب کرنے کا ارادہ ہے کیونکہ اکٹھا میں شائع نہیں کرنا چاہ رہی۔ غزل کی کتاب الگ اور نظم کی کتاب الگ شائع کرنا چاہتی ہوں۔

سوال۔ آپ کا اپنی شاعری کے بارے میں زاویہ نگاہ کیا ہے؟

جواب: یہ بہت مشکل کام ہے اور زیادہ بہتر یہ ہوتا ہے کہ انسان دوسروں کی رائے سنے اور ان کی رائے کی روشنی میں اپنے کام کو دیکھے اور میرا ہمیشہ سے صرف یہ نقطہ نظر نہیں ہے بلکہ اس پر میں نے ہمیشہ عمل بھی کیا ہے اور میں نے یہ دیکھا ہے کہ میری اپنی رائے اپنے کام کے بارے میں وہ ذرا کم ہوتی ہے اور مجھے Feedback اللہ کا شکر ہے کہ ہمیشہ بہت اچھا ملتا ہے تو میں اس کی روشنی میں دیکھتی ہوں کہ اس کام کو میں مزید کیسے بہتر بنا سکتی ہوں اور اگر کسی نے میرے کام کو اچھا کہا ہے تو میں واقعتاً اس کو اچھا بنانے کی کوشش کرتی ہوں۔ میری شاعری کا زیادہ تر انحصار آمد پر ہے۔ میں نے اس منصوبہ بندی کے ساتھ کہ آج غزل لکھنی ہے یا آج دس غزلیں لکھنی ہیں ایسا کبھی نہیں کیا۔ بس جو میرے ذہن میں آجاتا ہے خود بخود غزل یا نظم کی صورت میں سامنے آجاتا ہے۔ اس کے جو میرا کام ہوتا ہے، جو مجھے لگتا ہے کہ اصل کام یہ ہے کہ جب نظم یا غزل لکھی جاتی ہے تو اس کے بعد میں اس میں بہت زیادہ غور و فکر کرتی ہوں۔ بہت تبدیلیاں کرتی ہوں اور مطمئن تو خیر میں کبھی نہیں ہوتی لیکن بہر حال جب میرے خیال میں کچھ اس کی شکل و صورت بہتر ہو جاتی ہے تو میں وہ شائع ہونے کے لیے دے دیتی ہوں۔

سوال۔ آپ نے اپنی شاعری میں خواتین کے مسائل کے حوالے سے کون کونسے موضوعات پر آواز اٹھانے کی کوشش کی ہے؟

جواب: اچھا آپ نے لکھا ہے کہ آپ نے اپنی شاعری میں خواتین کے مسائل کے حوالے سے کون کون سے موضوعات پر آواز اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کا جواب میں پہلے دے چکی ہوں کہ میں کوشش نہیں کرتی جو میں محسوس کرتی ہوں جو میرے ذہن میں آتا ہے جو مجھے اچھا لگتا ہے تو وہ خود بخود

میرے تخلیقی عمل کا حصہ بنتا ہے اور لکھا جاتا ہے اور سامنے آجاتا ہے۔ اس میں خواتین کے بارے میں بھی ہے اس میں سماج کے بارے میں بھی ہے آپ تو تھیسز Thesis کر رہی ہیں۔ میری شاعری پڑھ رہی ہیں اس میں جو مختلف پہلو موجود ہیں جو مضامین اور موضوعات ہیں وہ میری اپنی شخصیت کے اندر ڈھل کے نکلے ہوئے ہیں۔ میں کوشش کر کے لکھتی بھی ہوں کیونکہ بعض اوقات لکھنا پڑتا ہے کہ Students کو کچھ لکھ کر دینا ہے یا کوئی خاص موضوع ہے، خاص دن کے حوالے سے لکھنا ہے تو میں لکھتی ہوں لیکن میں نے ایسی اس قسم کی شاعری کو اپنی کتابوں میں جگہ نہیں دی کیونکہ پتا نہیں کیوں وہ خواہ کتنی ہی Appreciate کیوں نہ ہو وہ شاعری، مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں نے اس کو بنایا ہے یعنی خود سے اُس کو کوشش کر کے لکھا ہے سامنے موضوع رکھ کر لکھا ہے۔ مجھے اپنی وہی شاعری پسند آتی ہے جو میں بغیر کسی کوشش کے لکھتی ہوں۔

سوال۔ آزاد اور نثری نظم کو کتنا اور کیوں پسند کرتی ہیں۔ اگر آپ سے نثری نظم کی تعریف پوچھی جائے تو آپ اس کی تعریف کس طرح کریں گی؟

جواب: آزاد اور نثری نظم میں سے جو سچی بات ہے مجھے آزاد نظم پسند ہے۔ مجھے جو دیگر نظم کی ہیئت ہیں مجھے ان سب میں سے آزاد نظم کا آہنگ زیادہ پسند ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں پابندی بھی اور آزادی بھی۔ پابندی اس کے آہنگ کی ہے کہ ایک خاص آہنگ پر جب آپ نظم شروع کر لیتے ہیں تو آپ اسی آہنگ کو لے کر چلتے ہیں۔ نثری نظم میرے مزاج سے شاید بہت قریب نہیں ہے اور جو لوگ لکھتے ہیں وہ بھی مجھے کم کم پسند آتی ہیں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ میں نثری نظم کے مخالف ہوں یا وہ مجھے پسند نہیں آتی، نہ میں مخالف ہوں بلکہ بہت سی نثری نظمیں مجھے پسند آتی ہیں لیکن خود میں نے شاید بہت کم لکھتی ہیں۔ بعض اوقات ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ لاشعوری طور پر یہ کام بھی کر کے دیکھا چاہیے۔ اس لیے نثری نظم کی کوشش کی ہے، کوشش کا لفظ تو غلط کہوں گی کیونکہ لاشعوری طور پر ذہن میں آتا ہے کہ اچھا فلاں ہیئت پہ میں نے کچھ نہیں لکھا تو جب یہ ذہن

میں رہتا ہے تو کچھ عرصے کے بعد چاہے سال بعد، دو سال بعد کسی نہ کسی ہیئت میں کچھ نہ کچھ لکھا جاتا ہے لیکن سب سے زیادہ میں نے آزاد نظم لکھی ہے کیونکہ مجھے مزہ اسی میں آتا ہے کیونکہ اس کی موسقیت، اس کی جو پابندی ہے وہ بھی اور اس کے اندر کچھ بھی کہنے کی آزادی مجھے پسند آتی ہے۔

اور نثری نظم کی تعریف آپ نے پوچھی ہے۔ اس کی اب تک بہت تعریفیں ہو چکی ہیں۔ کوئی اس نثم کہنا چاہتا ہے، کوئی نثری نظم کہنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے مختلف نام تجویز کیے گئے ہیں لیکن بہر حال میں تو یہ سمجھتی ہوں جو نثری نظمیں مجھے پسند آتی ہیں تو ان میں صرف ایسی نثری نظم جس کے اندر شعریت بھی ہو اگرچے اس طرح کی شعریت والی نثر جو ہے وہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ پرانی نثر جب ہم پڑھتے ہیں تو اس میں بعض ہمیں قافیہ بند نثر بھی ملتی ہیں۔ ایسی نثر میں جس میں ہم کہہ سکتے ہیں شعریت کا تڑکا بہت تیز لگا ہوتا ہے وہ بھی ملتی ہے لیکن پھر بھی ایک جمالیات کا احساس ہو، نثری نظم پڑھتے ہوئے اس کے اندر اور شعریت کا احساس ہو، نزاکت کا احساس مجھے زیادہ اچھی لگتی ہے۔

سوال۔ آج کل آپ نثر میں کیا لکھ رہی ہیں؟

جواب: آج کل میں نثری مضامین پر کچھ کتابیں تیار کی ہیں۔ جو کہ کمپوز ہو چکی ہیں۔ مختلف مضامین پر مبنی یہ تین کتابیں ہیں۔ دراصل یہ تحریریں کسی خاص منصوبے کے تحت نہیں لکھی گئیں بلکہ متفرق مضامین ہیں جو دوست احباب کے کہنے پر لکھتی رہی اور ان کی تقریبات میں پڑھتی رہی۔ تو جب میں نے ان کو مضامین کے حساب سے، موضوعات کے حساب سے میں نے ان کو کتابوں میں تقسیم کیا۔ تو ان میں ایک کتاب خواتین کے کام کے بارے میں ہے کہ خواتین کی جتنی کتب پر میں نے لکھا اس کو میں نے ایک کر لیا اور دو کتابیں دوسرے مضامین کی ہیں۔ یہ تین کتابیں آج کل میں ترتیب دے رہی ہوں۔ دو تو کمپوز ہو چکی ہیں۔ انشاء اللہ جلد شائع ہو گی۔

سوال۔ آپ کی ادبی سرگرمیاں اور کیا کیا ہیں؟

جواب : آج کل ادبی سرگرمیاں یہی ہیں کہ شاعری ہوتی رہتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اور کتابوں کی ترتیب و تدوین کا کام بھی جاری ہے اور نثر کا ہمیشہ سے یہی ہے کہ جب کسی نے کہا لکھ دیں تو لکھ لیتی ہوں۔

سوال۔ آج کل آپ کا منصب فرائض کیا ہے؟

جواب: میں شعبہ تدریس سے وابستہ ہوں۔ آج کل بھی وہی کام کر رہی ہوں۔ میں ایک کالج میں پڑھاتی ہوں اور یہی میرا کام ہے۔ کالج کا نام گورنمنٹ کالج کلیتہ اللبنات ڈگری کالج برائے خواتین لاہور، پوسٹ صدر شعبہ اسلامیات اور وائس پرنسپل ہوں۔

سوال۔ آپ کے شوہر ضیاء الحسن بھی ایک شاعر ہیں آپ ان سے اصلاح لیتی ہیں یا نہیں؟ آپ ان کے لکھنے کے کس انداز سے متاثر ہیں؟

جواب: اور آپ نے پوچھا ہے کہ میں ضیا صاحب کے لکھنے کے کس انداز سے متاثر ہوں تو میرے شوہر ہیں ظاہر ہے مجھے ان کا ہر انداز ہی اچھا لگتا ہے۔ وہ نثر بھی لکھتے ہیں، شاعری بھی کرتے ہیں۔ وہ جو بھی، جس انداز سے بھی کام کرتے ہیں میں تو اس کو Appreciate ہی کروں گی۔ البتہ میں اُن کی ویسے نقاد بھی ہوں۔ سب سے پہلے اُن کی چیزیں میں پڑھتی ہوں خاص طور پر نثری مضامین۔ اور بے لاگ رائے بھی دے دیتی ہوں کہ یہاں سے آپ کو درست کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ آپ نے پوچھا کہ آپ کے شوہر ضیاء الحسن بھی ایک شاعر ہیں آپ ان سے اصلاح لیتی ہیں یا نہیں۔

اصلاح لینے والا کام اصل میں میری Training میں نہیں آسکتا کیونکہ میں اپنی فیملی میں اس کام میں پڑنے والی واحد لڑکی تھی تو اس لیے یہ میری تربیت میں ہی شامل نہ ہو پایا کہ میں کسی کو دکھاؤں یا میں کسی سے پہلے اصلاح لوں اور جیسے میں نے آپ کو پہلے انٹرویو میں بتایا تھا کہ صرف میری Sister تھی جن کو میں سنایا کرتی تھی جب اُن کا انتقال ہو گیا تو یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا۔ ابتداء میں جہاں سے مجھے معلوم ہوا کہ ہاں یہ شاعری ہے اور میں شاعری کر سکتی ہوں۔ وہ ایک نام ہے وہ میری اردو کی ٹیچر تھیں مس شمیم عزیز۔ جن کو جب میں نے اپنی لکھی ہوئی چیزیں دکھائیں تو انھوں نے مجھے یہ اعتماد دیا کہ یہ شاعری ہے اور آپ کو لکھنا چاہیے اور اس میں بہت کم غلطیاں ہیں اور وہ غلطیاں بھی آپ کوشش کریں گی تو آپ دور کر سکتی ہیں اور انھوں نے اس کا مجھے طریقہ بھی بتایا انھوں نے کہا آپ جتنا ہو سکے آپ مطالعہ کیا کریں اس مطالعے کی یہ شرط نہیں ہے کہ صرف آپ شاعری پڑھیں جو آپ کو میسر ہو نثر ہے، نظم ہے، شاعری جو کچھ بھی آپ پڑھ سکتی ہیں آپ پڑھا کریں تو اس سے آپ کو اپنی تربیت کرنے میں مدد ملے گی۔ میں نے اُن کی ان دونوں نصیحتوں پر عمل کیا اور یہی کہہ لیجیے بس میری گائیڈ لائن یہی تھی جو آج تک میرے ساتھ چل رہی ہے۔ میں لکھتی ہوں اُس کے بعد خود ہی اس کی اصلاح کرتی ہوں خود ہی اُس کے اوپر نظر ثانی کرتی ہوں۔ کبھی کوئی مشورہ ہم آپس میں کر لیتے ہیں لیکن بہت کم ایسا ہوتا ہے وہ بھی اس صورت میں ہوتا ہے جب کوئی بات سمجھ میں نہ آرہی ہو کہ یہ میں نے لکھا ہے تو ایسی صورت میں ہم آپس میں Discussion کر لیتے ہیں لیکن اصلاح کا لفظ نہیں بول سکتے اس سلسلے میں بلکہ میری زندگی میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس سے میں نے اپنی شاعری میں اصلاح لی ہو۔ غلطیاں سب سے ہو جاتی ہیں مجھ سے بھی ہوتی ہیں۔ اتنا پڑھنے کے باوجود، اتنا مطالعہ کرنے کے باوجود غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ ان غلطیوں کو Underline کرتی ہوں، پھر کوشش کرتی ہوں ان کو درست کروں۔ اس چیز کو مزید بہتر کروں۔ اس سلسلے میں ہم ایک دوسرے سے مشاورت کر لیتے ہیں اگر کہیں الجھن آجائے تو گراں ہو Otherwise وہ اپنا لکھتے ہیں۔ میں اپنا لکھتی ہوں اور Mostly یہی ہوتا ہے کہ ہم چھپنے کے بعد ایک

دوسرے کی چیز کو دیکھ رہے ہوتے ہیں یا کسی مشاعرے میں ہم اکٹھے جائیں تو وہاں جب میں سناتی ہوں تو انھیں پتا چلتا ہے کہ اچھا یہ میں نے نئی چیز لکھی ہے اور جب وہ سناتے ہیں تو مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ غزل میں نے پہلے نہیں سنی یہ انھوں نے تازہ لکھی ہے۔

تاریخ: ۶ ستمبر ۲۰۱۸ء

دورانیہ: ۱۵ منٹ

وقت: 11:00 P.M to 11:15 P.M